مہرالنساء

مہرالنساء

موموکا پورا نام مہرالنساء تھا، مگر میں نے تمام عمر اسے مہرالنساء کہہ کرنہیں پکارا۔ میں اسے موموکہتا تھا، صرف مومو۔ پھر بھی میں نے اپنی کہانی کا نام مہرالنساء رکھ دیا ہے، کیونکہ یہ میری داستان نہیں ہے۔ یہ تو موموکی کہانی ہے اور مہرالنساء کی بھی۔ مہرالنساء یعنی عورت کی محبت کی، یہ عورت کی محبت کی کہانی ہے۔ مگر ایسے آپ کو میری بات سمجھ میں نہیں آئے گی، میری بات سمجھنے کے لیے آپ کو موموکی کہانی سننا پڑے گی۔

میری اور موموکی زندگی ایسی ہی تھی، جیسے شمع اور پروانے کی ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی شمع کے گرد پروانے کو ایک دائرے میں گھومتے دیکھا ہے؟ بہت چاہنے کے باوجود بھی پروانہ اس مدار سے نکل نہیں پاتا، راستہ نہیں بدل پاتا اور جب شمع بجھ جاتی ہے تو وہ نڈھال سا ہوکر گر جاتا ہے۔ زیاں شمع کا ہوتا ہے یا پروانے کا، میں فیصلہ نہیں کر پارہا۔

مجھے تو یہ علم بھی نہیں کہ پروانہ ہم دونوں میں سے کون تھا؟ شاید میں تھا، یا پھر شاید مامو تھی۔

موموکو میں اس وقت سے جانتا ہوں، جب وہ مہرالنساء ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ مومو بن گئی تھی اور پھر میں نے اسے مہرالنساء کبھی پکارا ہی نہیں، بلکہ میں نے تو اسے کبھی بھی نہیں پکارا۔ اسی لیے اس کو مہرالنساء کہتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے۔ یہ طرزِ تخاطب، بہت اجنبی سا ہے، بلکہ اب تو مومو بھی اتنی ہی اجنبی ہے جتنا یہ نام۔

موموکے کان میں اذان میں نے دی تھی، اس کو پہلا بوسہ بھی میں نے دیا تھا۔ اس کو نرس کے کھردرے ہاتھوں کے شکنجے سے اپنے بازوؤں میں سب سے پہلے میں نے ہی اٹھایا تھا۔ میری

جگہ اس وقت حیدر کو ہونا چاہیے تھا، کیونکہ مومو اس کی بیٹی تھی۔ مگر حیدر کے بہت سے مسائل تھے۔ وہ ہفتہ پہلے ایک اکنامک فورم میں شرکت کرنے کے لیے کینیڈا گیا تھا، اسے مومو کی پیدائش سے پچھلے روز ہی آ جانا تھا، مگر برف باری کے باعث فلائٹس ملتوی ہو گئیں اور وہ وہیں پھنس گیا۔ اپنی جگہ وہ بھی بہت تڑپا تھا، کیونکہ مومو اس کی اور سونیا کی پہلی اولاد تھی۔

حیدر کے کزن اور بہترین دوست ہونے کی حیثیت سے آنٹی نے مجھے فون کر کے بلوا لیا تھا۔

''حسان! مجھے اس وقت حیدر کی ضرورت ہے۔ اور وہ نہیں ہے، مگر تم بھی میرے لیے حیدر کی ہی طرح ہو۔'' وہ پریشان تھیں، اسی لیے اپنا پہلا جاب انٹرویو بھلا کر میں دوڑا چلا آیا اور پھر تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

جب نرس نے حیدر کی نومولود کمبل میں لپٹی بیٹی میرے حوالے کی تو ایک مسرت بخش احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے جھک کر بچی کو پیار کیا اور پھر ہسپتال کے سفید اور گرے ماربل سے بنے کاریڈور کے دوسرے سرے پر کھڑی آنٹی کے پاس اسے لے آیا۔

''آنٹی یہ حیدر کی بیٹی ہے۔'' اس سوئی ہوئی بچی کو میں نے آنٹی کی گود میں ڈال دیا۔ انہوں نے والہانہ انداز میں بچی کا ماتھا چوما۔ مگر یکدم سر اٹھا کر مجھے دیکھا، ان کی خوشی سے تمتماتے چہرے پر تفکر کی لکیریں ابھری تھیں۔

''سونیا کیسی ہے حسان؟''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ ٹھیک ہو جائے گی۔''

میرا مطلب تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ آنٹی پریشانی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے انہیں تسلی دینے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ میری پشت پر کسی نے کہا۔

''سونیا کے ہزبینڈ کون ہیں؟'' میں چونک کر پلٹا۔ میرے سامنے سفید اوور آل میں ملبوس، سپاٹ چہرے والی لیڈی ڈاکٹر کھڑی تھیں۔

''وہ یہاں نہیں ہیں، سونیا کیسی ہے؟'' میرے لہجے میں بے قراری تھی۔

''سوری، وہ بچ نہیں سکیں۔'' انہوں نے بتایا اور میں اپنی جگہ سن سا ہو کر کھڑا رہ گیا۔

آنٹی بے اختیار اپنی من چاہی بہو کے لیے رونے لگی تھیں۔ میں نے ایک ترحم آمیز نگاہ ان

کی باہوں میں سکون سے سوئی بچی پر ڈالی۔ مجھے اس پر بے حد ترس آیا تھا۔ بچے سے اس کی ماں چھن جائے، اس کا اندازہ مجھ سے بہتر کون کر سکتا تھا؟ میری ماں بھی تین برس کی عمر میں مجھ سے دور چلی گئی تھی۔ فرق یہ تھا کہ مومو کی ماں کو اللہ نے اس سے دور کر دیا تھا اور میری ماں کو ایک مرد نے، یعنی ان کے دوسرے شوہر نے۔ اس کے بعد مجھے کسی عورت کی محبت نہیں مل سکی تھی۔ میرے اندر اس بات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مومو کے اندر بھی پیدا ہو، مگر میں کیا کر سکتا تھا۔

حیدر بمشکل جنازے پر پہنچ سکا تھا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ اس کی اور سونیا کی لو میرج تھی۔ یہ بات مجھے اور بھی دکھی کر گئی۔

حیدر کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ آنٹی تعزیت کے لیے آنے والوں کو بھگتا رہی تھیں۔ کسی اور کی مدد نہ حاصل ہونے کے باعث میں اکیلا باہر کے بہت سے کام نمٹا رہا تھا۔ ایسے میں کسی کو بھی اس ایک دن کی بچی کا خیال نہ آیا، جو پتہ نہیں کہاں تھی۔

اس وقت بھی میں اپنی نگرانی میں مائی حلیمہ سے کچن سے برتن نکلوا رہا تھا، جب دفعتاً ایک چھوٹے بچے کے رونے کی آواز نے مجھے چونکایا۔ ''یہ کون رو رہا ہے؟''

''کوئی مہمانوں کا بچہ ہو گا۔'' حلیمہ نے پلیٹیں نکالتے ہوئے مصروف انداز میں کہا۔

میں یکدم بے چین سا ہو گیا۔ وہ بچہ مسلسل رو رہا تھا۔ حلیمہ کو کچن میں چھوڑ کر میں آواز کے تعاقب میں باہر آ گیا۔ رونے کی آواز پینٹری کے ساتھ بنے اسٹور روم سے آ رہی تھی۔ میں اسٹور روم کا نیم ہوا دروازہ پورا کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا، سامنے سلور کی ایک پیٹی پر کمبل میں لپٹی حیدر کی روتی بیٹی مجھے دکھائی دی تھی۔

دکھ، حیرت اور غصے سے میرا برا حال تھا۔ میں نے بچی کو اٹھا کر تھپکا، مگر وہ روتی رہی۔ میں نے اس کو باہر جا کر آنٹی کے حوالے کیا اور نوکروں کو ایک یادگار ڈانٹ پلا کر بچی کی نگہداشت پر لگا دیا۔ پتہ نہیں، وہ کب سے بھوکی تھی۔

اس رات حیدر کو پہلی دفعہ اپنی بیٹی دکھائی گئی۔ حیدر نے کسی فلمی باپ کی طرح بیوی کی موت کا ذمہ دار بیٹی کو ٹھہرا کر قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا، بلکہ اس کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

سونیا کی ڈیتھ کے چھٹے دن جب میں حیدر کی طرف گیا تو آنٹی نے مجھ سے پوچھا۔

"حسان! حیدر کی بیٹی کا نام کیا رکھیں؟"

ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے بغیر سوچے سمجھے میرے لبوں سے "مہر النساء" نکلا تھا۔

"مہر النساء" شاید آنٹی کو نام بیک ورڈ لگا تھا۔

"اس بچی کو محبت کی ضرورت ہے آنٹی، اور مہر کا تو مطلب ہی محبت ہوتا ہے۔" میں یونہی کہتا چلا گیا۔

"ہوں ٹھیک ہے، یہ نام بالکل ٹھیک ہے۔ حیدر سے میں نے پوچھا تو وہ "آپ کی مرضی" کہہ کر لاتعلق ہو گیا۔" پتہ نہیں اس نے اور سونیا نے اپنے بچے کے لیے کتنے نام سوچے ہوں گے۔" وہ یکدم افسردہ نظر آنے لگیں۔

"حوصلہ کریں آنٹی!" ایک دم بہت زیادہ تنہا ہو جانے والی آنٹی کو تسلی دینے لگا اور پھر نامحسوس طریقے سے میرا حیدر کے گھر آنٹی کی دلجوئی کے لیے آنا جانا بڑھتا گیا۔

وہ حیدر کے لیے بہت پریشان رہتی تھیں۔ حیدر نے خود کو ہر شے سے الگ تھلگ کر لیا تھا۔ اس کا زیادہ وقت اب اس کے کام میں گزرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ سگریٹ پیتا بھی دکھائی دیتا، حالانکہ سونیا کی ڈیتھ سے پہلے وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔

"مت کیا کرو اسموکنگ نقصان دے گی۔" ایک دن جب وہ لان میں ٹہلتے ہوئے سگریٹ پھونک رہا تھا تو میں نے اسے ٹوکا وہ چھبیس سال کا تھا۔ مجھ سے چار برس بڑا، مگر ہمارے بے تکلفی بلا کی تھی۔

"کبھی میں تمہیں منع کرتا تھا اور اب تم مجھے۔" اس نے سر جھٹکا "کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے حیدر! تم آنٹی اور مہر کو وقت نہیں دے رہے ہو۔ ان دونوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ اگر تم یونہی سگریٹوں کی طرح خود کو پھونکتے رہو گے تو نارمل لائف کی جانب آنا تمہارے لیے مشکل ہو جائے گا۔"

میرے سمجھانے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا، لیکن مجھے علم تھا، وہ میری بات نہیں مانے گا۔ مومو اور حیدر میری زندگی کی کہانی کے وہ کردار تھے، جنہیں کبھی میری بات نہیں ماننا تھی۔

میری زندگی میں ایک اور کردار میرے ابو تھے، جن کا دو برس پہلے انتقال ہوا تھا۔ بہن بھائی تھے نہیں، میں اکیلا رہتا تھا۔ ان دنوں نوکری کی تلاش کر رہا تھا۔ زندگی کے بارے میں میرے

پلان واضح تھے، ایک زبردست قسم کی جاب ڈھونڈ کر چار پانچ برس خود کو فنانشلی اسٹرانگ کرنا اور پھر کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر کے ہنسی خوشی رہنا۔ زیادہ مسائل میرے ہوتے نہیں تھے، سو روز شام اپنے گھر سے دس منٹ کی واک پر موجود حیدر کے گھر جا کر آنٹی کے ساتھ ایک کپ چائے پینے کا وقت خود بخود نکل آتا تھا۔

اسی طرح کی ایک عام سی شام جب میں آنٹی کی طرف آیا تو وہ لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھی، اپنے پوتی کے منہ میں چمچوں سے پانی ڈال رہی تھیں۔

"کیسے ہو حسان!" مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک مہربان تبسم بکھر گیا۔

"میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟"

"میں تو بس مہر کی جانب سے پریشان ہوں۔" اپنی گود میں لیٹی مہر پر جھکی، وہ تشویش سے کہنے لگیں۔

"رات سے اتنا تیز بخار ہے، اب میری الٹی سیدھی طبی امداد سے شکر ہے، کچھ کم ہوا ہے، ورنہ اتنے چھوٹے بچے کی تو کوئی دوائی بھی نہیں ہوتی۔"

"ارے اتنی پیاری سی بچی کو کیوں بخار چڑھ گیا؟" میں اٹھ کر مہر کے قریب آ گیا اور پیار سے اس کا گال چھوا۔ وہ اپنی دادی کو دیکھ رہی تھی۔

"مہر! اوئے گندی بچی، ادھر دیکھو۔" میرے پکارنے پر بھی وہ دادی کو ہی دیکھتی رہی۔ اس نے پنک کلر کے فراک کے ساتھ ہم رنگ اونی جرابیں پہن رکھی تھیں۔

"مہر! ادھر دیکھو۔" میں نے اسے متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"مہر گندی بچی! مومو!" غیر ارادی طور پر میرے لبوں سے مومو نکلا۔ اس نے ایک دم اپنی بڑی بڑی براؤن آنکھیں گھما کر مجھے دیکھا۔

مومو در اصل اس ناول کی ہیروئن کا نام تھی جو میں پچھلی رات پڑھ رہا تھا۔ مہر کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی میرے لبوں سے وہ نکلا اور اس دن سے اس کا نک نیم بن گیا۔ پھر ہم نے کبھی اسے مہر نہیں پکارا۔

وہ بہت پیاری بچی تھی۔ اس میں حیدر کی بہت شباہت تھی، خصوصاً اس کے اوپر والے ہونٹ کا کٹاؤ تو، ہو بہو حیدر کی طرح تھا، مگر بھوری آنکھیں اس نے سونیا کی چرائی تھیں۔

جب مومو نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تو اس کا مشغلہ مٹی کھانا بن گیا۔ آنٹی اس کے لیے دنیا بھر کے بہترین کھلونے لاتی تھیں، مگر مومو پھر بھی کسی بلی کی طرح رینگ کر لاؤنج سے باہر نکل جاتی اور لان میں کیاری سے مٹی نکال نکال کر کھاتی۔ مجھے جب بھی وہ مٹی کھاتی دکھائی دیتی، میں اسے ڈانٹ دیتا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ منع تو نہیں ہوئی، البتہ میری گاڑی پورچ میں داخل ہوتے ہی دیکھ کر وہ مٹی کھانا چھوڑ کر تیزی سے گھٹنوں پر چلتی ہوئی اندر روپوش ہو جاتی۔ وہ مجھ سے ڈرنے لگی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے صرف ڈانٹتا ہوں۔ اسی لیے جب اس شام میں حیدر کی طرف آیا اور وہ مجھے فراک میں ملبوس کیاری میں بیٹھی نظر آئی تو میں نے قدرے نرمی سے اسے پکارا

''مومو!''

مٹی کھاتے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ یکدم رکے۔ اس نے گردن اٹھا کر قدرے فاصلے پر مجھے کھڑے دیکھا تو اس کی مڑی ہوئی پلکوں والی بھوری آنکھوں میں یکدم بے تحاشا خوف سمٹ آیا۔ مٹی چھوڑ کر تیزی سے لڑھکتی ہوئی وہ اندر کی جانب بھاگی تھی۔

میں بے اختیار ہنس پڑا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ آنٹی اندر ہی بیٹھی تھیں۔ میں نے اس کو جا لیا۔

''آنٹی، یہ مٹی کھا رہی تھی۔''

''ارے حسان آؤ بیٹا۔'' انہوں نے ایک نظر کارپٹ پر بیٹھی مومو پر ڈالی، جواب ان کے صوفے کا بازو پکڑ کر کھڑی ہونے کی کوشش میں بار بار نیچے گر جاتی تھی۔

''بس اب میں کہاں بھاگ سکتی ہوں اس کے پیچھے؟ ذرا ادھر ادھر ہوئی تو یہ باہر نکل جاتی ہے۔'' اس کا منہ دھلا کر لانے کے بعد آنٹی کہہ رہی تھیں۔

میں ہنس دیا، پھر حیدر کے متعلق استفسار کیا۔

''حیدر کے پاس گھر کے لیے کوئی وقت نہیں ہے۔ اس کا تمام وقت اپنے آفس کے لیے ہے۔ گھر آتا ہے تو کمرے میں بیٹھ کر آفیشل ورک کرتا رہتا ہے۔ اس نے تو ان تمام مہینوں میں مومو کی شکل بھی ٹھیک سے نہیں دیکھی۔''

انہوں نے گود میں بیٹھی مومو کی جانب تاسف سے دیکھتے ہوئے، اس کے ماتھے پر آئے بھورے بال سنوارے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا حسان! میرے بعد میری مومو کا کیا بنے گا۔ میری مومو تو رل جائے گی۔'' ان کی نگاہوں اور لہجے میں اضطراب چھلک رہا تھا۔

اس وقت تو میں نے آنٹی کو تسلی دی، مگر اس رات مجھے آنٹی کی باتیں بہت یاد آئی تھیں۔

میں نے آپ کو بتایا تھا نا، میری ممی مجھے تین برس کی عمر میں چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ ان کے دوسرے شوہر مجھے نہیں رکھنا چاہتے تھے، سو میں ساری زندگی بابا کے ساتھ رہا۔ ماں کی محبت کی کمی نے میرے اندر جو خلش چھوڑی تھی، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خلا بن گئی تھی اور اسی خلا، اسی خلش اور ذات کے ان ہی اندھیروں پر ہی تو میں یہ کہانی آپ کو سنا رہا ہوں۔ یہی بات تو میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں، مگر آپ کو یہ سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آپ جب تک میری کہانی پوری سن نہیں لیں گے، آپ کو میری منطق، میری تھیوری سمجھ میں نہیں آئے گی۔

اپنی ماں کی جدائی کے بعد میری تھیوری یہ تھی کہ اس دنیا کی ہر عورت بے وفا ہوتی ہے۔ عورتیں ہمیشہ آخر میں چھوڑ جاتی ہیں، بے وفائی کر کے تنہا کر جاتی ہیں۔ آپ کو میری بات بری لگے گی، مگر آپ کو میری بات سمجھنے کے لیے میری پوری کہانی سننا پڑے گی۔

❋ ❋ ❋

''کدھر ہوتے ہو تم حسان؟ اب تو حیدر کی طرح تمہارے پاس بھی ماں کو دینے کے لیے چند منٹ بھی نہیں۔'' مجھے دیکھتے ہی آنٹی نے بے حد شاکی انداز میں کہا۔

''پورے چار مہینے بعد شکل دکھائی ہے اپنی!''

''سوری آنٹی میں کراچی تھا، وہاں پر مسائل ہی اتنے تھے کہ پھنس کر رہ گیا۔'' ان کے اپنائیت بھرے شکوؤں نے مجھے کافی شرمندہ کر دیا تھا۔

مومو کافی بڑی ہو چکی تھی، چلتی پھرتی نظر آ رہی تھی اور تو اور، اب وہ بولتی بھی تھی۔ البتہ مجھ سے ابھی تک ڈرتی تھی۔

اسے دیکھ کر میں نے ایک دوستانہ مسکراہٹ اچھال دی، مگر وہ خاموشی سے اپنی بڑی، بھوری آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

میں آنٹی سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اتنے عرصے بعد مل رہا تھا، کچھ میں سنا رہا تھا تو کچھ وہ۔ بولتے بولتے میرا حلق خشک ہو گیا تو میں نے سوچا کہ ذرا بات مکمل کر کے پانی پی آؤں۔

"مانی!" مومو کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے رک کر بے حد چونکتے ہوئے اپنے دائیں جانب دیکھا۔ مومو اپنے ننھے منے ہاتھوں میں پانی کا گلاس تھامے کھڑی تھی۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"مومو! میں نے پانی نہیں مانگا۔" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ اسے میرے لیے پانی لانے کو کس نے کہا تھا۔

"آپ کو پاش (پیاس) لگی ہے؟" وہ اپنی توتلی زبان میں پوچھ رہی تھی۔ اتنی سی بچی نے اندازہ کرلیا تھا کہ مجھے پیاس لگی ہے اور وہ دوڑ کر میرے لیے پانی لے آئی تھی۔ میں بے حد شاکڈ تھا۔

"تھینک یو مومو!" میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے تھام لیا۔

"میری مومو بہت کیئرنگ ہے۔" آنٹی نے پیار سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ "جیسے ہی حیدر تھکا ہارا گھر آتا ہے، مومو فوراً اس کو پانی پلاتی ہے۔"

مجھ جیسے اپنے آپ سے واسطہ رکھنے والے بندے کو ایک بہت چھوٹی لڑکی کا یہ خیال دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی۔

مومو کچھ اور بڑی ہوئی تو آنٹی کو اسے اسکول میں ڈالنے کی فکر ہوئی۔

"آنٹی! ابھی تو بمشکل ڈھائی سال کی ہوگی، ابھی اسے اسکول مت ڈالیں۔"

"حسان! میں چاہتی ہوں۔ مومو اپنی عمر سے ایک دو برس آگے اسٹڈیز کرلے۔ چلو ابھی اسکول میں نہیں ڈالتے، مگر اسے گھر میں نرسری اور پریپ پڑھا کر ڈیڑھ سال بعد ڈائریکٹ ون میں داخل کرائیں گے۔" وہ پہلے سے پلان کر کے بیٹھی تھیں۔ "تمہیں نہیں پتہ، میری مومو بہت سمجھ دار ہے۔ اس کا ذہن اس کی عمر سے آگے ہے۔"

آنٹی کا مجھے قائل کرنے کے لیے کہا گیا وہ آخری فقرہ میرے ذہن کے پردوں سے چپک کر رہ گیا۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ جو بات میرے ذہن میں ایک دفعہ بیٹھ جاتی تھی، وہ کبھی نہیں نکلتی تھی۔

* * *

اس روز میں چند کتابیں خریدنے مارکیٹ گیا۔ مطالعہ میرا شوق، میرا جنون تھا۔ کتابوں کے معاملے میں، میں ہمیشہ سے اعلیٰ ذوق اور کریزی رہا تھا۔ اس روز بھی چند اعلیٰ قسم کی کتابیں خرید کر

میں کاؤنٹر پر کھڑا پے منٹ کر رہا تھا، جب دائیں جانب رکھے ریک پر سجی چند کلرنگ بکس اور اردو انگریزی کے حروف تہجی کے قاعدوں نے میری توجہ اپنی جانب کھینچی۔

پہلا خیال میرے ذہن میں مومو کا آیا تھا، چنانچہ میں نے چند کتابیں خرید لیں۔

شام کو حیدر کی طرف گیا تو جاتے ہی کتابوں والا شاپر مومو کو تھمایا۔ "یہ تمہاری ہیں۔"

وہ میرے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور شاپر سے بار بار تینوں بکس نکل کر دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے سے تھے اور کتابیں بڑی اور موٹی تھیں۔

"تھینک یو۔ پر ان کا کیا کروں؟" اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھتے ہوئے متانت سے پوچھا، اس کی بھوری آنکھوں میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

"ان کو پڑھو۔"

"وہ کیسے؟" اس نے مڑی ہوئی پلکیں اٹھا کر معصومیت سے مجھے دیکھا۔

"تم ہی پڑھا دو نا، حسان!" آنٹی جو کافی دیر سے ہماری ایکٹویٹی دیکھ رہی تھیں، بول اٹھیں۔

"پڑھا دوں گا، اگر آپ کو میرا روز بروز کا آنا برا نہ لگے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو حسان؟" وہ برا مان گئیں۔

"یہ تمہارا اپنا گھر ہے، غیروں کی طرح تکلف نہ کیا کرو اور اب تم روز آ کر اس کو پڑھاؤ گے، اس عمر میں مجھ سے یہ پڑھانے والا کام نہیں ہوتا۔" وہ پھر مومو کی جانب پلٹیں۔

مومو دونوں ہتھیلیاں چہرے کے گرد رکھے، دلچسپی سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

"اور مومو! اب یہ حسان انکل آج سے تمہارے سر ہیں ٹھیک ہے؟"

مومو نے فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یوں اس روز سے میں مومو کا ٹیچر بن گیا۔ اتنے چھوٹے بچے کو پڑھانے کے لیے بہت زیادہ قوت برداشت درکار ہوتی ہے، مگر اپنی عمر سے آگے سوچنے والی سمجھ دار مومو کے ساتھ مجھے کوئی مسئلہ نہ ہوا۔

ہاں وہ سوال بہت کیا کرتی تھی۔

"سر! ہم ہنستے کیوں ہیں؟"

"سر! آسمان بلیو کیوں ہوتا ہے؟ گرین کیوں نہیں ہوتا؟"

"سر! یہ پانی کا کوئی کلر کیوں نہیں ہوتا؟"

"سر! یہ دھاگا کیسے بنتا ہے؟"

اور میں اس کے سوالوں کا جواب ہمیشہ تفصیل سے دیا کرتا تھا۔

"مومو! تمہیں پاپا ٹائم دیتے ہیں؟" اس روز وہ اسٹڈی روم میں میرے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھی، اپنی کتاب کو ہمارے درمیان رکھی اونچی ٹیبل پر رکھے dotted letters پر پنسل پھیر رہی تھی، جب یونہی میں نے پوچھ لیا۔

"دادو کہتی ہیں پاپا کے پاس ٹائم نہیں ہوتا۔" وہ چہرہ اٹھائے اور رکے بغیر بولی۔

"تمہیں برا تو لگتا ہوگا؟" میں اس کی محرومیوں کی شدت سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔ "دادو، کہتی ہیں پاپا از اے بزی مین!" وہ اتنی سی عمر میں سمجھوتا کر چکی تھی۔

پھر ایک روز جب میں اسے میتھ کے ہندسے سکھا رہا تھا، اس نے پنسل میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میری ماما بہت اچھی تھیں؟"

"ہاں، وہ بہت اچھی تھیں۔"

"پھر وہ مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟"

"بھئی، وہ موموکو ہمارے پاس چھوڑ کر تو گئی ہیں۔" میں نے اسے بہلانا چاہا، مگر وہ شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولی۔

"مگر آپ تو ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "اگر نہ ڈانٹوں تو تم میری چھوٹی سی پیاری سی فرینڈ بن سکتی ہو؟"

"جی سر!" اس کی بھوری آنکھوں میں دیئے سے جل اٹھے تھے۔ اس روز سے وہ بہت حساس، سمجھ دار، ذہین اور عام بچوں کی طرح ضد نہ کرنے والی مومو میری بہت اچھی دوست بن گئی۔ وہ مجھ سے بہت باتیں کرتی تھی، یہاں تک کہ جب وہ ڈائریکٹ ون میں داخل ہونے کے بعد اسکول جانے لگی تو شام کو اپنے پورے دن کی روئیداد مجھے سناتی تھی۔

جہاں اس کی پڑھائی کی ذمہ داری مجھ پر تھی، وہاں اس کے اسکول فنکشنز اور پیرنٹ ٹیچر میٹنگز اٹینڈ کرنا بھی میرا فرض بن کر رہ گیا تھا۔

اس طرح وہ میرا خیال رکھتی تھی۔ جس لمحے میں گھر میں داخل ہوتا، وہ بھاگ کر مجھے پانی پلاتی۔ اگر آنٹی کے بصد اصرار میں شام کو کھانا ان کی طرف کھا لیتا تو مومو ہمیشہ میرے قریب بہت الرٹ سی بیٹھی ہوتی تھی۔ جونہی میں آخری نوالہ لیتا، وہ فوراً اٹھ کر ٹشو کا ڈبہ میرے سامنے کر دیتی۔ مجھے کبھی بھی موموکو کسی بھی چیز کے لیے پکارنے کی عادت ہی نہ پڑی تھی۔ اسی لیے میں ساری عمر سیکھ ہی نہیں سکا کہ اس مڑی ہوئی پلکوں والی لڑکی کو پکارنا ہے۔

"حسان صاحب! بہتر تھا کہ مہر کے فادر آتے۔" موموکی کلاس تھری کی انچارج (نام مجھے یاد نہیں) نے مجھے پیرنٹ ٹیچر میٹنگ میں دیکھ کر بے اختیار کہا تھا۔

"وہ ملائیشیا گئے ہوئے ہیں۔"

"کیا وہ ہمیشہ کہیں نہ کہیں گئے ہوئے نہیں ہوتے؟ خیر، یہ دیکھیں مہر النساء نے کلاس روم کا گل دان توڑ ڈالا ہے۔"

"اس سے غلطی سے ٹوٹا ہوگا، ورنہ وہ خاصی سمجھدار ہے، پھر بھی آپ فائن بتائیں۔" میں نے جیب میں بٹوے کے لیے ہاتھ ڈالا۔

"میں نے آپ کو جرمانہ بھرنے کے لیے نہیں بلایا۔"

ناک پر رکھی عینک کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہوئے ان کا انداز قطعی اور دوٹوک تھا۔

"مومو نے گل دان توڑ دیا، یہ قابل معافی بات تھی، مگر اس نے بجائے مجھے بتانے کے، ٹوٹے گل دان کی کرچیاں کپ بورڈ میں چھپا دیں۔ وہ تو بعد میں، میں نے سختی سے پوچھا تو اس نے بتا دیا۔"

میں لب بھینچے انہیں دیکھتا رہا۔

"مجھے غصہ گل دان پر نہیں، بلکہ اس کا اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے پہ چڑھا ہے، وہ ہمیشہ یہی کرتی ہے۔"

"میں اسے سمجھاؤں گا میڈم!"

اس شام کو موموکو اپنے سامنے اسٹڈی روم میں بٹھا کر میں کافی دیر لب بھینچے، سنجیدہ نگاہوں

سے اس کا چہرہ تکتا رہا۔

"کیا ہوا سر؟" میری نگاہوں کی سنجیدگی سے قدرے خائف ہو کر اس نے مڑی ہوئی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"موموتم نے واز توڑا ہے؟"

بھوری آنکھوں میں یکبارگی خوف سمٹ آیا۔

"آپ کو کس نے بتایا سر؟"

"مجھے میری بات کا جواب دو۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"مومو۔" میں نے لہجہ قدرے دھیما کر دیا۔

"غلطی سے ٹوٹا تھا۔" اس کی باریک اور معصوم آواز ابھری۔

"پھر تم نے اسے چھپا کیوں دیا؟" اس نے ماتھے پر آئے بال ہٹاتے ہوئے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "میڈم ڈانٹتیں اس لیے!"

"اگر تم میڈم کو سچ بتا دیتیں تو وہ نہ ڈانٹتیں۔"

"سچ بولنے پر ڈانٹ نہیں پڑتی؟"

"بالکل بھی نہیں!" میں زور دے کر بولا۔

اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔

"غلط بالکل غلط۔ اس روز حلیمہ کی بیٹی سے گملا ٹوٹ گیا تھا، دادو نے پوچھا تو اس نے بتا دیا، دادو نے اسے بہت ڈانٹا۔ اس نے بھی تو سچ بولا تھا نا؟" وہ میری ٹانگ جتنی لڑکی مجھ سے بحث کر رہی تھی۔

اس کے انداز سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

"اور میں نے جھوٹ بھی نہیں بولا۔ میڈم نے مجھ سے پوچھا تھا تو میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں نے نہیں توڑا۔"

"تم نے کچھ بھی نہیں کہا تھا اور یہ بھی جھوٹ ہوتا ہے۔"

"اور آپ بھی تو ہر پیرنٹ ٹیچر میٹنگ پر میڈم کو یہ کہتے ہیں کہ پاپا ملائیشیا گئے ہوئے ہیں، پاپا سنگاپور گئے ہوئے ہیں، یہ بھی تو جھوٹ ہوتا ہے نا؟"

اس کا جملہ بہت غیر متوقع تھا۔

"مومو! پاپا بزی ہوتے ہیں۔" میں نے بات کا رخ بدل کر اس بچی کو مزید صاف گوئی سے روکنا چاہا۔

"پتہ ہے۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ مجھے لگا وہ چھوٹی سی لڑکی مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ اب میں کیا کروں؟ اسے کیسے مناؤں؟ مجھے تو مومو کو منانا ہی نہیں آتا تھا۔

میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، جانے سے پہلے حلیمہ اسے روز چائے کا ایک کپ پکڑاتی تھی، وہ مجھے لا کر دیتی تھی، مگر میں جانتا تھا۔ اس روز مومو نہیں آئے گی، اسی لیے جانے لگا۔

"سر چائے!" جانے کس کونے سے نمودار ہو کر اس نے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے چائے کا کپ میرے سامنے رکھا، مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی۔

شاید مومو ناراض نہیں تھی۔

یا پھر شاید اسے مجھ سے توقع نہیں تھی کہ میں اسے مناؤں گا۔

***

مومو آٹھ برس کی ہوئی تو میں نے اسے رنگین صفحوں والی غالباً سنڈریلا کی اسٹوری بک لا دی۔ اگلی شام جب میں حسب معمول اسے پڑھانے آیا تو اس نے مجھے میتھس کے ٹیبلز سنانے کے بجائے سنڈریلا کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیئے۔

"سر...... سنڈریلا کے باپ نے دوسری شادی کیوں کر لی تھی؟" اس کا معصوم ذہن جو سوالات بناتا تھا، وہ ان کے جوابات مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

اس روز اس نے بالوں کی فرنچ بریڈ بنا رکھی تھی، جب کہ اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ رنگ تو مجھے یاد نہیں، اب اس بڑھاپے میں، میں ستر کی دہائی میں ہونے والی باتیں باریکیوں کے ساتھ تو یاد نہیں رکھ سکتا نا، بہرحال وہ بچپن میں عموماً اسکرٹس پہنا کرتی تھی جو اس پر بے حد اچھی لگتی تھی۔

"سر! مجھے اور بھی بکس لا دیں۔" اس نے فرمائش کی، میں نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔

پھر آہستہ آہستہ میں مومو کے لیے چھوٹے چھوٹے تحائف لانے لگا۔ میرے گفٹس ہمیشہ

کوئی اسٹوری بک یا کلرنگ بک ہوتے تھے۔

پھر ایک دن آنٹی نے مجھے ٹوک دیا۔ ''حسان وہ اتنی سی ہے، اس کو اتنی کتابیں مت پڑھاؤ۔''

مگر میں نے ہنس کر ٹال دیا کہ ''رہنے دیں آنٹی! میں تو دیکھ بھال کر اچھی کتابیں ہی لاتا ہوں، جو اسے شعور دیں۔'' تو آنٹی خاموش ہوگئیں۔

اس روز بھی اس کے لیے بک خریدنے میں اسٹور پر گیا تو مجھے اشفاق احمد کی ''ایک محبت سو افسانے'' وہاں نظر آئی۔ میں نے وہ خرید لی اور اس میں سے دو ایسے افسانے جو ہر لحاظ سے مومو کی عمر کے لحاظ سے معیوب اور غیر موزوں نہ تھے، مارک کر دیئے۔

''یہ دو پڑھ لینا۔'' شام کو اسے کتاب دیتے ہوئے میں نے تاکید کی۔

اس نے عدم دلچسپی سے کتاب اٹھائی، الٹ پلٹ کر دیکھا اور قدرے اداسی سے واپس رکھ دیا۔

''آپ کوئی اور بک لے آتے سر۔'' اسے شاید اتنی گاڑھی اردو والی کتاب میں دلچسپی نہ تھی۔

''شاید پسند نہیں آئی تمہیں۔ مگر پڑھ کر دیکھ لو۔''

''یہ بات نہیں ہے سر!'' اس نے سر جھٹکا، پھر عادتاً میز پر کہنی رکھتے ہوئے بولی ''دراصل میں یہ پڑھ چکی ہوں۔''

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ''تم......تم یہ پڑھ چکی ہو؟ کہاں سے لی؟''

''پاپا کی لائبریری سے۔'' وہ بڑے فخر سے مسکرائی۔

''مومو! تم مجھ سے پوچھ کر بکس پڑھا کرو۔''

اس کے لبوں سے مسکراہٹ یکدم معدوم ہوگئی، وہ کہنی میز سے ہٹا کر قدرے مؤدب سی ہو کر بیٹھ گئی۔

''جی سر!''

وہ ڈر گئی تھی، اس لیے نرم لہجے میں اس نے کہا۔

''وہ اس لیے کہ تمہیں ان کا بیک گراؤنڈ وغیرہ سمجھا سکوں۔''

اس کے چہرے پر مجھے قدرے اطمینان دکھائی دیا۔ میرا خیال تھا، اب وہ مجھ پر اعتبار کرنا

سیکھ لے گی، مگر یہ میری بھول تھی۔ ہاں، یہی تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، یہی کہ ہم میں سے کسی کو دوسرے پر اعتبار نہ تھا، مگر ایسے آپ کو میری بات سمجھ نہیں آئے گی۔ آپ کو مومو کی پوری داستان سننا پڑے گی۔

✻✻✻

مومو میرے سامنے بیٹھی سائنس کا ہوم ورک کر رہی تھی، میں اخبار پڑھتے ہوئے گاہے بگاہے اس پر نظر ڈال لیا کرتا تھا۔ یکدم مجھے کچھ یاد آیا۔

''مومو!'' میں نے اخبار تہہ کر کے میز پر رکھتے ہوئے اسے پکارا۔ وہ جو کاپی پر جھکی ہوئی تھی، ہاتھ روک کر مجھے دیکھنے لگی۔

''جی سر؟''

''تمہارا ٹیسٹ ہو گیا سائنس کا؟''

''جی سر!''

''کتنے مارکس آئے؟''

وہ پل بھر کو خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''وہ تو ٹیچر نے واپس ہی نہیں کیا۔''

میں اکتیس سال کا مرد اور وہ نو سال کی بچی، مجھے صاف پتہ چل گیا، وہ جھوٹ بول رہی تھی۔

''کھڑی ہو جاؤ!'' ایک دم میں دوست سے ٹیچر بنتے ہوئے درشتی سے بولا۔ وہ ہکا بکا کھڑی ہوگئی۔

''اپنا بیگ کھول کر مجھے دکھاؤ۔'' میں نے حکم دیا۔ وہ مرے مرے ہاتھوں سے بیگ کھولنے لگی۔ وہ جان بوجھ کر آہستہ آہستہ کھول رہی تھی۔ میں نے بیگ اس سے لے کر کھول دیا۔ سامنے سائنس کا ٹیسٹ پڑا تھا۔ میں نے ایک کاٹ دار نگاہ اس پر ڈال کر ٹیسٹ اٹھایا، پھر نمبر پڑھ کر ٹیسٹ اس کے سامنے پھینکا۔

''یہ اس پر 10 میں سے 4 نمبر پڑھ کر مجھے بتاؤ کہ تم نے Nutrition والا سوال کیوں نہیں یاد کیا تھا اور مجھے یہ بھی بتاؤ کہ تم نے ٹیسٹ چھپایا کیوں؟'' اس کی یہ غلطی کر کے چھپا دینے کی عادت مجھے خوب تاؤ دلا رہی تھی۔

اس نے سر جھکا دیا۔ ''میں ڈرامہ دیکھنے لگی تھی اور چھپایا اس لیے کہ آپ ڈانٹتے۔''

''میں نے تمہیں ہزار دفعہ سمجھایا ہے کہ غلطی کر کے اس پر پردے مت ڈالا کرو، مگر تم ہو کہ......'' غصے سے میں اٹھا، میز سے چابی اٹھائی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

مجھے مومو پر شدید غصہ تھا۔

اگلے دو دن میں اسے پڑھانے نہیں گیا، تیسرے روز مجھے ایک عجیب سی فکرمندی ہوئی۔ مجھے اس کو ڈانٹنا نہیں، بلکہ آرام سے سمجھانا چاہیے تھا۔ وہ اتنی اکیلی ہے اور میں...... اسی شام میں حیدر کی طرف چلا گیا۔

مومو حسب معمول اسٹڈی میں نہیں تھی، مجھے وہ سر گھٹنوں میں دیئے ہوئے سیڑھیوں پر بیٹھی نظر آئی۔ میں چند سیڑھیاں چڑھ کر اس کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔

''ہیلو چھوٹی لڑکی!''

اس نے چونک کر سر اٹھایا، اس کی بھوری آنکھوں میں سرخی تھی اور گالوں پر آنسوؤں کے نشانات مجھے یکدم بے چینی سی ہوئی۔

''کیا ہوا ہے مومو؟ تم رو رہی ہو؟'' اس نے نفی میں سر ہلا کر آنکھیں ہتھیلیوں سے رگڑیں۔

''بتاؤ مجھے، کیا ہوا ہے؟'' میں پریشان سا ہو گیا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے سر ایک دفعہ پھر گھٹنوں پر رکھ دیا۔

''مومو مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کیا میری کسی بات پر ناراض ہو؟'' میں نے اس کو شانوں سے پکڑ کر اس کا سر اونچا کیا۔

''نہیں سر!'' اس کے انکار پر مجھے حیرت ہوئی، کیونکہ میرا خیال تھا، وہ میرے ڈانٹنے پر رو رہی تھی۔

''پھر؟'' میں نے جانچتی نگاہ سے اسے دیکھا۔

نچلا لب کاٹتے ہوئے وہ اپنے پاؤں کو دیکھنے لگی۔

''مومو!'' میں نے پھر اسے پکارا۔

''سر...... ضیا نے...... ضیا نے بہت برا کیا ہے۔'' اس کی آواز تھراتی ہوئی تھی۔

''ضیا کون؟ کیا کر دیا اس نے؟'' میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ ''جنرل ضیا اور کون سر؟'' اس

نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ضیا نے کل بھٹو کو پھانسی دے دی ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ! مومو تم......!'' مجھے اس وقت اس پر شدید غصہ آیا تھا۔ ''یہ بات تھی جس پر تم نے مجھے اتنا پریشان کیا ہے؟''

''آپ کو افسوس نہیں ہوا سر؟'' اس کے انداز میں حیرت تھی۔

''مومو! یہ پالیٹیکس ہے، تم اتنی سی عمر میں ان سیاست دانوں کو نہیں سمجھ سکتیں اور مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہیں بھٹو اتنا پسند تھا۔'' میرا عملی طور پر سیاست سے کوئی واسطہ نہیں تھا، مگر چونکہ ابو کٹر مسلم لیگی تھے تو ظاہر ہے، میری ہمدردیاں ضیاء کے ساتھ تھیں۔ ایسے میں مومو کا رویہ میرے لیے حیران کن تھا۔

''سر مجھے پالیٹکس کا پتہ نہیں، مگر بھٹو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔'' وہ افسوس سے کہہ رہی تھی۔

''دماغ خراب ہے تمہارا...... یہ تمہاری عمر ہے سیاست میں دلچسپی لینے کی؟ خبردار جو میں نے تمہیں آئندہ اخبار پڑھتے دیکھا۔ اتنا پریشان کیا تھا مجھے اب اٹھو ذرا۔''

''مگر سر......'' میں اس کی ایک بھی سنے بغیر اسے باہر لے آیا۔

''ارے حسان! دیکھو ذرا اس لڑکی کو کیا ہوا ہے؟ صبح سے کمرے میں بند ہے۔'' مجھے دیکھ کر آنٹی کو مومو کی اداسی کا خیال آیا۔

''یہ میرے ساتھ کھڑی ہیں محترمہ! کچھ نہیں ہوا، بس ذرا سا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ ابھی ٹھیک کر کے لاتا ہوں۔'' میں مومو کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے آیا۔

''کدھر سر؟''

''کہیں جا کر تمہیں آئس کریم کھلاتے ہیں، تاکہ تم پر سے یہ سوگ اترے۔'' مجھے ابھی تک غصہ چڑھا ہوا تھا۔

''سر!'' اس نے تاسف سے مجھے دیکھا۔ ''آپ کو پتا ہے میں آئسکریم نہیں کھاتی۔''

''اُفوہ؟'' وہ جتنا میری باتیں یاد رکھتی تھی، میں اتنا ہی بھول جاتا تھا۔ مومو کو میٹھے کے نام پر ہر شے سے الرجی تھی۔

وہ میری زندگی میں آنے والی واحد لڑکی تھی، جو چاکلیٹ کو Too Sweet اور آئس کریم کو

Too Cold کہہ کر رد کر دیتی تھی۔

’’چلو چل کر کڑوی سی کافی پیتے ہیں، وہ تو تم شوق سے پیو گی نا؟‘‘ میرے جلے بھنے انداز پر وہ ہنستے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔

****

میں نے جوں ہی چائے کی پیالی سے آخری گھونٹ بھرا، میرے سامنے والے صوفے سے مومو اٹھی اور اندر چلی گئی۔

’’حسان شادی کرلو۔‘‘ آنٹی نے اپنا مگ ختم کر کے میز پر رکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

’’اچھا!‘‘ قدرے ہنس کر میں نے چائے کا کپ سائیڈ پر رکھا۔

’’ٹالو مت۔ میری نظر میں ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔‘‘ ان کی آواز میں ماؤں کی سی فکر مندی تھی۔

’’اچھا کون؟‘‘ میں نے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر لبوں تلے رکھی اور لائٹر سے اسے سلگایا۔ اسی پل مومو ہاتھ میں ایش ٹرے لیے لاؤنج میں داخل ہوئی اور اسے میرے صوفے کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اپنی نشست سنبھال لی۔ اسے علم تھا کہ میں چائے کے بعد سگریٹ ضرور پیتا ہوں۔

’’عفت آپا کی بیٹی نائمہ۔ اسی سال اس نے ماسٹرز کیا ہے، صورت شکل بھی اچھی ہے اور.....‘‘ پھر نائمہ بی بی کی جملہ خصوصیات پر طویل لیکچر دے کر قدرے بے چینی سے انہوں نے استفسار کیا۔

’’اب بتاؤ چلاؤں رشتے کی بات؟‘‘

’’ہوں۔ جیسے آپ کی مرضی۔‘‘ میں مسکرادیا۔ نائمہ کو میں کافی عرصے سے جانتا تھا۔ وہ میری اور حیدر کی سیکنڈ کزن تھی۔ بلاشبہ وہ ایک آئیڈیل لڑکی تھی۔

’’کس کے رشتے کی بات دادو؟‘‘ رشتے کا لفظ سن کر مومو نے نہایت دلچسپی سے پوچھا۔

’’تمہارے سر کے رشتے کی بات کر رہی ہوں۔‘‘

’’سر کے۔‘‘ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ’’سر شادی کریں گے؟‘‘

’’کیوں؟ کیا شادی کا حق صرف تمہارے ابا کو ہے؟‘‘ یونہی مذاق میرے منہ سے نکل گیا، اگلے ہی پل مومو کے چہرے پر پھیلنے والی ویرانی دیکھ کر بے حد پچھتایا۔

’’میرا مطلب تھا.....‘‘ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ تیزی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

’’ماں یاد آگئی ہوگی۔‘‘ اسے جاتا دیکھ کر آنٹی نے تاسف سے سر ہلا دیا۔

میں ایک دم افسردہ سا ہو گیا، شاید میں نے مومو کو بھی اداس کر دیا تھا۔ ایک لمحے کو میں نے اٹھ کر اس کے پیچھے جانے کا سوچا، مگر مجھے تو مومو کو منانا ہی نہیں آتا تھا۔ سو میں بیٹھا رہا۔

چند ثانیے بعد وہ خود ہی واپس آگئی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں چھپی اداسی کو میں ماں کی موت کا ہرا ہوتا زخم جان کر خاموش رہا۔

نائمہ اور میرا رشتہ اگلے دو ماہ کے دوران طے ہو گیا۔ میں برسرروزگار، ویل سیٹلڈ آدمی تھا۔ اتنا ہینڈسم نہیں تھا، مگر فنانشلی مضبوط تھا اور وہ بھی پڑھی لکھی، خوبصورت اور قابل لڑکی تھی۔ بھلا کس کو اعتراض ہوتا تھا، سب کچھ خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ مگر کوئی خوش نہیں تھا تو وہ مومو تھی۔

****

اس روز میں نائمہ کو لے کر حیدر کی طرف چلا گیا، میں نائمہ کو مومو سے ملوانا چاہتا تھا۔ مومو دروازے پر ہی ہمیں مل گئی۔

’’یہ مومو ہے نا؟‘‘ اسے دیکھ کر نائمہ مسکرائی۔ مومو نے نظریں اٹھا کر اسٹائلش اور طرح دار سی نائمہ کو دیکھا اور پھر میری جانب متوجہ ہوئی۔

’’سر! کل میرا انگلش کا ٹیسٹ ہے۔ مجھے تیاری تو کرا دیں پلیز۔‘‘ اس کا انداز عجیب سا تھا۔

’’یار! ابھی تو ہم آئے ہیں، اندر تو آنے دو۔‘‘ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر آگے بڑھا۔ وہ سائیڈ پر ہو گئی۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے چند لمحے بعد ہی مومو وہاں آگئی۔ آنٹی اتفاق سے گھر پہ نہیں تھیں۔ ہم بتا کر نہیں آئے تھے، غلطی سراسر ہماری تھی۔ اب مومو ہی ہماری میزبان تھی۔

’’تو یہ ہے مہرالنساء! حسان صاحب کی چھوٹی سی فرینڈ جس نے نسیم حجازی سے لے کر کرشن چندر تک سب کو پڑھ لیا ہے۔‘‘ نائمہ کے انداز میں ستائش تھی۔

مومو نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا، مگر بولی کچھ نہیں۔ اس نے پنک کلر کی شلوار قمیص

پہن رکھی تھی اور لمبے بالوں کی چٹیا بنا رکھی تھی۔ شلوار قمیص میں وہ قدرے مختلف لگتی تھی۔ مگر فی الحال یہ اس کا رویہ تھا، جو مجھے مختلف لگا تھا۔

"ہاں یہی مومو ہے۔ ابھی بے تکلف نہیں ہے نا تم سے، اس لیے بول نہیں رہی۔" میں نے مسکرا کر کہا تاکہ نائمہ زیادہ محسوس نہ کرے۔

پھر نائمہ نے اس سے مزید باتیں کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ہوں، ہاں میں جواب دیتی یا خاموش رہتی۔

میں اس کے روکھے رویے کی وجہ نہیں جان پایا تھا۔

"سر! میرا ٹیسٹ!" ہم واپس جانے لگے تو اس نے مجھے یاد دلایا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں رک جاؤں اور نائمہ چلی جائے۔

"ہاں میں فارغ ہوا تو شام میں آؤں گا۔"

ہولے سے اس کا گال تھپتھپا کر اس کے چہرے پر پھیلنے والی مایوسی نظر انداز کر کے میں آ گیا۔

سسرال میں لنچ تھا، وہاں ایسا پھنسا کہ رات کو دیر سے فارغ ہوا۔ بے اختیار مومو کی طرف نہ جا سکنے کا افسوس ہوا مگر یہ اطمینان تھا کہ اس نے ٹیسٹ خود تیار کر لیا ہوگا۔

یہ چند روز بعد کا قصہ ہے، میں مومو کو اس کے اسٹڈی روم میں انگلش ٹینسز کرا رہا تھا، جب اچانک وہ بولی "سر!"

"جی؟"

"سر! یہ جو نائمہ آنٹی ہیں نا، یہ......" وہ رک گئی۔

"ہاں بولو یہ کیا؟" میں پین رکھ کر پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ آخر میں اس کی نائمہ سے پرخاش کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

"کل ہم ان کے گھر گئے تو میں نے خود سنا سر! وہ اپنے نوکر کو گالی دے کر بلا رہی تھیں۔"

"مومو!" میں نے اسے گھورا۔

"جھوٹ کب سے بولنے شروع کر دیئے ہیں تم نے؟" وہ ایک دم سٹپٹا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ نائمہ کو میں کافی عرصے سے جانتا تھا، وہ خاصی مہذب، شائستہ اور دھیمے لب و لہجہ میں

بات کرنے والی لڑکی بھلا گالی کیسے دے سکتی تھی۔ مجھے مومو پر غصہ آیا تھا۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں، تمہاری نائمہ آنٹی کو۔ یوں کسی کی برائی نہیں کرتے۔ اب ایسی بات نہ کرنا۔" لہجے کو ہموار رکھ کر بھی میں نے اسے اچھا خاصا ڈانٹ دیا۔ وہ لب کاٹتے ہوئے اپنی گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھتے رہی۔

صفائی میں ایک لفظ نہ بولی۔

"تمہیں نائمہ آنٹی بری لگتی ہیں مومو؟" میں نے اب کی بار قدرے نرمی سے پوچھا تو اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"جی...... بہت زیادہ۔" پھر وہ کاپی پر جھک کر اپنا کام کرنے لگی۔

وہ چھوٹی بچی جسے کسی وجہ سے نائمہ بری لگتی تھی، اس کی ذات سے سچی جھوٹی باتیں منسلک کر کے مجھے بتا رہی تھی۔ بچے عموماً ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور میرے نزدیک یہ ایسی بڑی بات نہ تھی

مومو میری بہت پیاری دوست اور نائمہ میری ہونے والی بیوی تھی۔ میں دونوں کے درمیان تلخی نہیں چاہتا تھا، اس لیے جب اس روز عفت آنٹی کے یہاں کسی کام سے میں ان کی طرف جانے لگا تو کچھ سوچ کر گاڑی حیدر کے گھر کی جانب جانے والے رستے پر ڈال دی۔ حیدر کی کالونی کی سڑک پر داخل ہوتے ہی مجھے مومو دکھائی دی۔ وہ میری گاڑی سے قدرے آگے سڑک پر سائیکل چلا رہی تھی۔ اس نے بلیو Beggy جینز اور سفید آدھے بازوؤں والی کھلی سی ٹی شرٹ کے اوپر بالوں کی لمبی سی فرنچ بریڈ بنا رکھی تھی، میں اس کی پشت پر تھا۔ گاڑی قدرے آگے لے جا کر اس کے ساتھ لے آیا۔ گاڑی دیکھ کر اس نے سائیکل سائیڈ پر کرنا چاہا۔ پھر دفعتاً ڈرائیونگ سیٹ پر نگاہ پڑی تو دوپہر کے ٹائم مجھے وہاں دیکھ کر چونکی۔

"سر! آپ ادھر؟"

"تم اتنی دوپہر میں باہر کیوں پھر رہی ہو؟" میں نے اپنی جانب کا شیشہ کھول دیا۔ وہ سائیکل روک کر اتر گئی۔

"میں بس رائیڈنگ کر رہی تھی۔ آپ بتائیں، آپ اتنی دوپہر میں کیوں پھر رہے ہیں؟" وہ شرارت سے مسکرا کر بولی۔

"میں تمہیں پک کرنے آیا ہوں، چلو بیٹھو اندر۔" میں نے فرنٹ سیٹ کا لاک کھول دیا۔

"اور یہ سائیکل؟"

"اسے بھاگ کر گھر چھوڑ آؤ۔ تمہارے پاس صرف ایک منٹ ہے۔" میں نے مصنوعی تحکم سے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کیا مجھے کافی پلانے لے جا رہے ہیں؟" کچھ دیر بعد جب وہ سائیکل گھر چھوڑ کر میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تو پوچھنے لگی۔

"ارے نہیں، ہم تمہاری نائمہ آنٹی کے گھر جا رہے ہیں۔ عفت آنٹی کو کچھ چیزیں دینا تھیں۔ بس پانچ منٹ لگیں گے۔" میری وضاحت پر وہ سر ہلا کر شیشے کے پار دیکھنے لگی۔

عفت آنٹی کے گھر کی ڈور بیل خراب تھی۔ چونکہ دروازہ کھلا تھا، ہم اندر داخل ہو گئے۔

"تم پہلے آئی ہو ادھر؟"

"جی کئی دفعہ۔" اس کے انداز میں سنجیدگی تھی۔ میں نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ میرے بائیں طرف روش پر میرے ہمراہ چل رہی تھی۔ اس کا سر میرے بائیں بازو کی کہنی تک پہنچ رہا تھا۔

مرکزی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ گولڈن کلر کے خوب صورت ہینڈل پر رکھ کر اسے گھمایا ہی تھا کہ دروازے کی درز سے اندر سے آنے والی بلند آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"بشیراں! بشیراں!" وہ نائمہ تھی اور چلا رہی تھی۔ "کدھر مر جاتی ہو؟ نشہ کر کے سوتی ہو؟ ادھر آؤ، یہ برتن تمہارا باپ اٹھائے گا؟"

میرے قدم جہاں تھا وہیں تھم گئے۔ میں سن سا ہو کر رہ گیا۔ مومو کا ہاتھ ابھی تک ہینڈل پہ تھا۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا اور بے نیازی سے بولی۔

"See i told you!"۔ اس نے بے نیازی سے شانے جھٹکے۔ "مگر آپ کو مومو ہمیشہ جھوٹی ہی لگتی ہے۔" اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ پورا کھولتے ہوئے زور سے ناک کیا۔ "نائمہ آنٹی! مے وی کم اِن؟" آج اس کا لہجہ کھردرا یا روکھا نہیں، بلکہ فاتحانہ اور سرخ روئی کا تاثر لیے ہوئے تھا۔ میں خود کو کمپوز کر کے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کے پیچھے اندر داخل ہوا۔

نائمہ جو لاؤنج میں صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر ٹی وی دیکھ رہی تھی، ہمیں دیکھ کر بری طرح چونکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے آپ لوگ، آیئے نا۔" لباس کی شکنیں درست کر کے اس نے دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا۔

"دراصل بیل خراب تھی، اس لیے ہم بلا جھجک اندر آ گئے۔ آنٹی کہاں ہیں؟ ان کی چیزیں دینا تھیں۔" میں نے کھڑے کھڑے وضاحت کی، جب کہ مومو بڑے آرام سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"ممی تو سو رہی ہیں، ٹھہریں میں اٹھاتی ہوں۔" وہ اپنی مصنوعی شائستگی سے کہتے ہوئے اندر جانے لگی، مگر میں نے فوراً روک دیا۔

"نہیں انہیں مت اٹھائیں۔ بس بتا دیجیے گا کہ میں آیا تھا۔ چلو مومو!" میں نے مومو کو پکارا، جو بڑی خوشی خوشی نائمہ کے لاؤنج کا جائزہ لے رہی تھی۔

"آپ لوگ بیٹھیں تو سہی۔" اس نے صوفے پر رکھے کشن درست کیے۔

"نہیں تھینکس نائمہ! ہم چلتے ہیں۔ مومو کی ٹیوشن کا وقت ہونے والا ہے، چلو مومو!" میں نے صوفے پر استحقاق سے بیٹھی مومو کو گھورا۔

"کوئی بات نہیں سر! کل کوئی ٹیسٹ نہیں ہے۔ آج چھٹی ہو جائے گی تو کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے اطمینان سے مدبرانہ انداز میں کہا۔

"بہت شوق ہے تمہیں چھٹی کا، چلو اٹھو۔" بوکھلائی گھبرائی نائمہ کو خدا حافظ کہہ کر میں مومو کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ واپسی پر تمام راستہ ہم دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ جب میں نے گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے روکی تو اس نے اترنے کے لیے لاک کھولا۔

"مومو!" میری آواز پر وہ دروازہ کھولتے کھولتے رک گئی۔ "جی سر؟"

"جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے، تب تم نے کیوں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا؟" میں بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

اس نے اپنی مڑی ہوئی پلکیں اٹھائیں۔

"سر! دادو کہتی ہیں جو لوگ سچے ہوتے ہیں انہیں صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سر! خلیل جبران کہتا تھا، اس نے کہا میں نے مان لیا، اس نے زور دیا، مجھے شک گزرا، اس نے قسم کھائی، میں نے کہا، یہ تو جھوٹ بولتا ہے۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔ "پھر بھی سر! آپ کو میں ہمیشہ

جھوٹی ہی لگتی ہوں۔"

"مگر مومو......"

"میں جاؤں سر؟"

میں نے ایک گہری سانس اندر کو کھینچی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں جاؤ۔"

"خدا حافظ سر!" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

* * *

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے، جب عفت آنٹی نے سرسری طور پر مجھ سے حسن کی آمد کا تذکرہ کیا۔

حسن نائمہ کا ماموں زاد تھا، وہ بالکل ویسا ہی تھا، جیسا جین آسٹن کا کوئی ہیرو ہوتا ہے۔ بے تحاشا دولت مند، بہت خوبصورت اور شاندار پرسنالٹی رکھنے والا۔ حسن امریکہ میں سیٹلڈ تھا۔ اس کا اور اس کے والد کا وہاں کین فوڈ کا وسیع و عریض بزنس تھا۔ وہ دونوں سال دو سال بعد پاکستان کا چکر لگا ہی لیتے تھے، مگر اس دفعہ کچھ خاص وجہ تھی۔

آنٹی نے مجھ سے ذکر نہیں کیا، مگر بہر حال میں کوئی بچہ تو تھا نہیں۔ تینتیس سالہ میچور مرد تھا۔ اتنا تو بہر حال جان گیا تھا کہ حسن کے والد احمد مراد نے نائمہ کا رشتہ، میرا اور نائمہ کا رشتے طے ہو جانے کے چند روز بعد مانگا تھا۔ وہ یقیناً اس بات سے لاعلم تھے کہ میرا رشتہ نائمہ کے والدین قبول کر چکے ہیں چونکہ ابھی صرف زبانی کلامی بات ہوئی تھی، اس لئے نائمہ کے گھر والوں نے ہمارا رشتہ اوپن نہیں کیا تھا۔ اس کے ماموں کو ان کے اصرار پر اس بات کا علم ہوا تو وہ اپنے بیٹے سمیت پاکستان پہنچ گئے۔ میں نے ان دنوں نائمہ کے گھر جانا قطعاً ترک کر دیا تھا۔

اور پھر جب میں اس روز مومو کو پڑھانے گیا تو آنٹی مجھے قدرے بجھی بجھی لگیں۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا بتاؤں حسان! اتنے چاہ سے تمہارا رشتہ کرایا تھا، پہلے تو وہ لوگ راضی تھے، مگر اب کھنچے کھنچے لگ رہے ہیں۔ عفت آپا کو کل فون کیا تو منگنی کی بات پر دہ کہنے لگیں، پھر دیکھا جائے گا، ابھی تو رشتہ بھی پینڈنگ میں ہے۔ لو بھلا پہلے خود وہاں کی تھی اور اب پینڈنگ ہو گیا۔"

"جانے دیں آنٹی! آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔" میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ اسی

اثناء میں حیدر داخلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں کوٹ تھا۔

"کیسے ہو حسان؟" وہ تھکی تھکی آواز میں پوچھتا میرے مقابل بیٹھ گیا۔

"میں تو ٹھیک ہوں، آنٹی البتہ پریشان ہیں۔" اس نے ماں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

آنٹی نے الف سے یے تک تمام قصہ کہہ سنایا۔

"ممی ٹھیک کہہ رہی ہیں، وہ نائمہ کا کزن نہیں ہے، کیا نام ہے اس کا؟" حیدر نے آنکھیں میچ کر یاد کرنے کی کوشش کی۔

"حسن" میرے لبوں سے پھسلا۔

"ہاں حسن، یہ اس کی دولت کی چمک ہے۔ مجھے نہیں لگتا، اب عفت آنٹی حسان کے رشتے والی بات یاد بھی رکھیں گی۔"

"لو یہ کوئی کاروبار ہے؟ حیدر میاں جہاں وعدے کر کے توڑ دیئے جائیں! آپا نے ہمیں زبان دی تھی۔ اگر بھانجا اتنا ہی پیارا تھا تو پہلے اس کا خیال کیوں نہ آیا۔ اس وقت تو بہت خوشی خوشی میرے حسان کا رشتہ قبول کیا تھا۔" وہ بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

حیدر نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ "ممی بہت بھولی ہیں۔"

"پاپا جوس۔" مومو کسی بوتل کے جن کی طرح تازہ اورنج جوس کا گلاس تھامے حیدر کے قریب نمودار ہوئی۔

"تھینک یو بیٹا!" حیدر نے گلاس لے لیا۔ میں نے اس کے لہجے پر غور کیا۔ خوش دلی، شفقت، اپنائیت سب تھا، اس میں، بس محبت نہیں تھی، یا پھر وہ اتنی میکانکی زندگی گزارنے لگا تھا کہ محبت ہوتی، بھی تو محسوس نہ ہوتی تھی۔

میں نے مومو کا چہرہ دیکھا، وہاں کوئی رنج، کوئی افسوس نہیں تھا۔ میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

* * *

حیدر اور آنٹی کی باتوں کے باوجود میں نے حسن مراد کی آمد کو نظر انداز کیا تھا، مگر پھر نائمہ کا میرے آفس فون آیا۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ 20 جولائی 1981ء دن گیارہ بج کر پچیس منٹ۔ وہ وقت میرے دماغ پر ثبت ہو کر رہ گیا۔

میں چاہوں بھی تو نائمہ کی وہ کال نہیں بھلا سکتا۔ میں نے آپ کو کہا تھا نا کہ مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔ میں آپ کو یہی بتانا چاہتا تھا، لیکن ابھی آپ کو سمجھ نہیں آئے گا۔ آپ کو میری بات سمجھنے کے لیے میری پوری کہانی سننی پڑے گی۔

"حسان!" اس نے بہت شرمندہ شرمندہ لہجے میں کہا تھا۔ "آپ بہت اچھے ہیں اور کوئی بھی لڑکی آپ کے ساتھ پر فخر کر سکتی ہے، لیکن میں وہ لڑکی نہیں ہوں۔ میں بچپن میں بہت سی چیزوں کے لیے ترستی تھی، جن میں ایک آسائشات کی فراوانی بھی تھی۔ گو اب ہمارے حالات بہت اچھے ہیں، مگر میں بچپن کے وہ چند سال کبھی نہیں بھول سکتی، جب ابو کی نوکری چھٹی تھی اور ہم نے اپنا گھر بیچ ڈالا تھا۔" اس نے گہری سانس خارج کی۔ اس کی سانس کے اخراج کی آواز مجھے آج بھی یاد ہے۔

"حسان! میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے بھی ڈیزائن ویئر اور قیمتی جیولری صرف شاپس میں سجی دیکھ سکیں اور پھر ان سے فقط اپنے خواب سجا پائیں۔ میں نے خواب سجائے تھے، میں ساری زندگی صرف خوابوں پر گزارا نہیں کرنا چاہتی۔ یونانی کہاوت ہے خوش قسمتی کی دیوی آپ کے دروازے پر صرف ایک دفعہ دستک دیتی ہے۔ میرے دروازے پر وہ دیوی دستک دے رہی ہے۔ پلیز مجھے زندگی سے اپنے لیے کچھ حاصل کر لینے دیں......"

وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی، مگر میں نے فون رکھ دیا، میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

نائمہ سے مجھے کوئی افسانوی قسم کا دھواں دھار سا عشق نہیں تھا، وہ تو ایسی تھی، جیسے راہ چلتے بہت سے لوگ مل کر بچھڑ جاتے ہیں۔ وہ تو اسی دن میرے لیے بہت عام ہو گئی تھی، جب میں نے اس کی "شائستگی" سنی تھی۔ وہ تو کبھی بھی خاص نہیں تھی۔

میرے لیے صرف ایک شے خاص تھی۔ وفا اور صرف وفا۔ میری ماں مجھے بچپن میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ایک عورت کی اس بے وفائی نے میرے اندر جو خلش رکھ چھوڑی تھی، وہ میں کسی دوسری عورت کی وفا سے پر کرنا چاہتا تھا مگر۔

20 جولائی کی اس گرم دوپہر کو مجھے علم ہوا تھا کہ عورت تو بے وفائی کا دوسرا نام ہے۔ کبھی میری ماں مریم نثار کی دوبارہ گھر بسانے کی خواہش کی صورت میں اور کبھی نائمہ سعید کی زندگی سے کچھ حاصل کرنے کی تمنا کی صورت میں، بے وفائی رنگ بدلتی ہے مگر میں اسے ہر روپ میں پہچانتا تھا۔

جانتا ہوں آپ لوگوں میں سے بہت سوں کو میری بات سخت ناگوار گزرے گی، مگر میں نے کہا نا آپ میری تھیوری، میری منطق، میری دلیل ابھی نہیں سمجھ سکتے۔

میں پھر کہوں گا کہ آپ کو میری پوری کہانی سننی پڑے گی۔

****

نائمہ سے منگنی میں نے اس شام توڑ دی، آنٹی نے خاموشی سے میری بات سنی اور اسی وقت عفت آنٹی کو فون کر کے سب کچھ توڑ ڈالا۔

نائمہ کی شادی اسی سال سردیوں میں ہو گئی۔ وہ چند ہفتوں بعد امریکہ شفٹ ہو گئی اور جن دنوں مومو 8th میں تھی، نائمہ کے ہاں دو جڑواں بیٹوں کی پیدائش ہوئی۔ نائمہ خواب و خیال، حال یا مستقبل میں کہیں بھی نہیں تھی، مگر اس کی عطا کردہ خلش کسی درخت سے چمٹی امربیل کی طرح ساری زندگی میرے ساتھ رہی۔

جس روز مومو کا 8th کلاس کا رزلٹ آنے والا تھا، اس نے مجھے آفس فون کیا۔

''سر! آپ نے اخبار دیکھا؟'' اس کی آواز میں اتنی خوشی اور جوش تھا کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''سر میں نے فیڈرل بورڈ میں ٹاپ کیا ہے، اخبار دیکھیں نا!'' میں سارے کام چھوڑ کر اپنے نک چڑھے باس کی پرواہ کیے بغیر حیدر کے گھر چلا آیا۔

وہ جو لان میں اخبار گود میں رکھے بیٹھی تھی، میری گاڑی گھر کی حدود میں داخل ہوتے دیکھ کر بھاگتی ہوئی، میرے پاس آئی۔ ''سر! آپ آ گئے؟''

اس کی سنہری رنگت شدت جذبات سے گلنار ہو رہی تھی۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ وہ ہنس رہی تھی۔

اس لمحے اپنی گاڑی سے لان تک چلتے ہوئے بارہ سالہ مومو کو دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا کہ ''خوشی'' ایک مجسم صورت میں میرے سامنے کھڑی ہے۔

''سر...... یہ اخبار دیکھیں نا، میں نے ٹاپ کیا ہے۔'' اس نے اخبار آگے کرتے ہوئے وہ سطر مجھے دکھائی جہاں ''مہر النساء حیدر'' جگمگا رہا تھا۔

اس کی پر جوش کیفیت پر مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کا رزلٹ دیکھنے کے لیے اخبار نہیں، اس کا شفق رنگ چہرہ ہی کافی تھا۔

''مجھے تم پر فخر ہے مومو!'' اخبار اس کے ہاتھ سے لے کر اس کا نام پڑھتے ہوئے میں نے خوشی سے مخمور لہجے میں کہا۔ اس لمحے مجھے مومو کا ٹیچر ہونے کی حیثیت سے اتنی خوشی ہوئی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔

''مہر النساء، آئی ایم سو پراوڈ آف یو!'' میں نے اس ننھی پری کا گال تھپتھپایا۔ ''اینڈ آئی لو یو سو مچ!'' اس کی مسکراہٹ ایک لمحے کو وہیں تھم گئی، وہ ایک دم تو جیسے سانس لینا ہی بھول گئی تھی۔

"You do sir"۔ اس کے لہجے میں بے حد خوشگوار حیرت تھی۔

''آف کورس!'' میں مسکرایا۔ ''ہماری مومو ہے ہی اتنی اچھی، اس سے سب ہی پیار کرتے ہیں۔''

وہ ایک دم بہت کھل کر ہنسی جتنی خوشی اسے میرے اس جملے پر ہوئی تھی، اتنی تو شاید اپنے رزلٹ پر بھی نہیں ہوئی تھی۔

''ٹھہرو میں تمہارے لیے کچھ لایا ہوں۔'' میں نے گاڑی کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر رکھا، سرخ گلابوں کا بوکے اور بند پیکٹ اٹھایا، جو میں نے راستے میں سے ہی لیا تھا۔

''یہ تمہارا گفٹ، میں جلدی میں یہی لا سکا ہوں۔''

''اوہ سر!'' فرط جذبات سے اس کی آواز رندھ گئی۔ اس نے دونوں چیزیں تھام لیں، پھول بہت تھے سر!'' اس کے انداز میں تشکر تھا۔

''پھول بہت نہیں تھے، یہ تو مرجھا جائیں گے، مگر یہ گفٹ تو تمہارے پاس ہمیشہ رہے گا۔'' میری مادہ پرست سوچ کی پرواز یہیں تک تھی۔

''مرجھانے سے کیا ہوتا ہے سر؟ ان کی خوشبو، ان کا اثر اور سب سے بڑھ کر ان نتیج نہیں

ختم ہوتا۔'' سرخ گلابوں کے بکے کو چہرے کے قریب لے جا کر اس نے آنکھیں موند کر اسے سونگھا۔

''اچھا کھولو تو سہی۔ بتاؤ تو سہی تمہیں کیسا لگا ہے۔'' میں نے اس کی بات پر غور نہیں کیا، میں نے کبھی بھی مومو کی بات پر غور نہیں کیا تھا۔

وہ پھول گاڑی کی چھت پر رکھ کر وہیں پورچ میں کھڑے کھڑے احتیاط سے ریپر کھولنے لگی۔ میں اپنی گاڑی سے ٹیک لگا کر اس کی ایکسائٹمنٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''واؤ!'' لائٹ پنک کلر کی ڈائل والی خوبصورت گھڑی اس کو بہت پسند آئی تھی۔ اس نے جھٹ اس کو کلائی پر پہنا۔

''یہ اسٹریپ بند کر دیں سر!'' اس نے معصومانہ انداز میں کلائی میری جانب بڑھائی۔ میں نے مسکراتے ہوئے پنک کلر کا اسٹریپ بند کر دیا۔

''کتنی اچھی ہے نا، تھینک یو سر!'' مختلف زاویوں سے گھڑی کو اپنی دودھیا کلائی پر سجا دیکھنے کے بعد اس نے بہت تشکر سے کہا تھا۔

''ارے یہ تو کچھ نہیں ہے۔ کارنامہ تو تم نے انجام دیا ہے۔ اچھا اب اندر آنے دو۔ کب سے ہم پورچ میں کھڑے ہیں اور حیدر کہاں ہے؟'' اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔

''پاپا اپنے بیڈ روم میں۔''

ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ اس سے حیدر کی جانب سے ملنے والے تحفے کے متعلق پوچھوں مگر پھر بھی مجھے خیال آیا کہ حیدر کے پاس اسے دینے کے لیے ایک نرم مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

* * *

''آپ بیٹھیں، میں ذرا نوڈلز لے آؤں۔'' مجھے اسٹڈی روم میں بٹھا کر وہ جانے لگی تو میں نے اسے روکنا چاہا۔

''یہ کھانا پینا بعد میں ہوتا رہے گا، ابھی تو بیٹھو۔''

''نہیں سر! پھر وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی اور آپ دوبارہ گرم کی ہوئی چیزیں پسند نہیں کرتے۔''

وہ کہہ کر چلی گئی اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

جب سے مومو نے چودھویں سن میں قدم رکھا تھا، اسے کوکنگ کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ بقول آنٹی کے، وہ حیدر یا ان کے لیے نہیں، صرف میرے لیے کبھی چائنیز تو کبھی دیسی مرغن کھانے بناتی تھی۔ شاید اس کا یہ شوق اس دن کے بعد پیدا ہوا تھا، جب میں نے اسے باتوں باتوں میں کہا تھا۔

''مجھے اچھا کھانے کا شوق ہے۔''

وہ نوڈلز لینے گئی تو میں قدرے فراغت سے اسٹڈی روم کا جائزہ لینے لگا۔

میری اور مومو کی کرسی کے درمیان بچھی میز پر رکھے مومو کے اسکول بیگ کی زپ کھلی ہوئی تھی، جس میں سے ایک رنگ برنگی سی کتاب جھانک رہی تھی۔ میں نے قدرے متجسس سا ہو کر وہ کتاب، جو دراصل ایک کلرفل سی ڈائری تھی، نکال لی۔ مومو ڈائری نہیں لکھتی تھی، میں نے پہلا صفحہ کھولا۔

وہاں "Amna Ikram's Scrap Book" لکھا تھا۔

وہ اس کی دوست آمنہ اکرام کی اسکریپ بک تھی۔ جو اس نے یقیناً مومو کو فل کرنے کے لیے دی ہو گی۔ چونکہ وہ ایک قطعاً غیر پرائیویٹ شے تھے، اس لیے میں اس کے صفحے الٹ پلٹ کر پڑھنے لگا۔

ایک صفحے پر آ کر میں ٹھٹک کر رکا، صفحے کے اوپر نیلے مارکر سے Your First Crush لکھا تھا۔ نیچے آدھا صفحہ فل تھا، جس میں ہر سطر میں لڑکیوں نے اپنے نام کے سامنے اپنے Crushes لکھ رہے تھے۔ میں نے صفحے کے وسط میں آخری لکھی ہوئی سطر پڑھی۔ "Mehrun Nisa My first Crush was zulfiqar ali Bhutto"۔ میں نے اسکریپ بک بند کر کے اسے میز پر واپس رکھ دیا، چند برس پہلے سوچی گئی ایک خام خیالی آہستہ آہستہ میرے شک میں بدلتی جا رہی تھی، آہٹ پر میں سنبھل کر بیٹھ گیا، مومو ہاتھ میں بھاپ اڑاتے نوڈلز کے پیالوں سے سجی ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔

میں نے قدرے بے توجہی سے نوڈلز کھایا۔

''آپ کو اچھی نہیں لگی؟'' مومو اور دوسرے کی عدم دلچسپی محسوس نہ کرے، ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا چہرہ پل بھر میں اتر گیا۔

"نہیں یہ بہت اچھے ہیں مگر مجھے تم سے بات کرنی تھی۔" میں نے پیالہ میز پر رکھ دیا۔

"کیا بات ہے سر؟" اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

"مومو، میں نے یہ اسکریپ بک پڑھی ہے، یو ڈونٹ مائنڈ اِٹ رائٹ؟"

"ناٹ ایٹ آل سر!"

"تم نے لکھا تمہارا فرسٹ کرش ذوالفقار علی بھٹو تھا، رائٹ؟" سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"جی سر!" وہ اب کچھ الجھی تھی۔

"مومو تمہاری عمر کیا ہے؟"

"چودہ سال۔"

"اور تمہارا خیال ہے تمہیں ایسی باتیں کرنی چاہئیں؟"

"سر، یہ صرف ایک مذاق تھا، فرینڈز کے درمیان ایک ہلکا پھلکا سا مذاق۔"

"یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھنے کے بجائے اپنی عمر کے مطابق فیشن، کپڑوں، جیولری اور مہندی کے ڈیزائنوں میں دلچسپی لیا کرو، اپنی عمر سے آگے بھاگو گی تو تھک جاؤ گی، مومو!" وہ سر جھٹک کر کتابیں کھولنے لگی۔ یہ اس کا خفگی کا اظہار تھا۔ میں نے گہری سانس بھر کر ٹھنڈے ہوتے نوڈلز کے پیالوں کو دیکھا، جن کی تعریف میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے بھی نہیں کی تھی۔

* * *

"مومو جانتی ہو، تمہارے ہاتھوں کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

اس روز اس کی لمبی، پتلی، آرٹسٹک انگلیوں کو دیکھ کر میں نے بے ساختہ پوچھا تھا۔ وہ ہنس دی۔

"جی...... یہی کہ میں پینٹر یا سرجن بنوں گی۔"

"میڈیکل میں تو تمہیں انٹرسٹ نہیں ہے...... آرٹ کے متعلق کیا خیال ہے؟"

اس نے ایک نظر اپنے ہاتھوں کو دیکھا، پھر پین لبوں میں دبا کر کچھ سوچ کر بولی۔ "میں اکثر اسکیچز بناتی رہتی ہوں، دکھاؤں آپ کو؟"

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ مومو پہلی دفعہ کوئی بات میرے علم میں لائے بغیر کرتی رہی تھی۔ ورنہ وہ تو ہر کام مجھے بتا کر کرتی تھی۔

"اور تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔" میں نے خفگی سے شکوہ کیا۔

"وہ بہت اچھے نہیں ہیں۔" وہ جھینپ گئی۔

میں نے میز پر رکھا اخبار منہ کے آگے کر لیا۔ اس نے اخبار کھینچ لیا۔

"میں کوئی مائیکل اینجلو نہیں بن گئی، جو آپ کو خبر نہیں ہوئی۔ میں نے صرف دو چار تصویریں بنائی ہیں، وہ بھی ماشاء اللہ اتنی بھیانک ہیں کہ آپ مروت میں بھی تعریف نہیں کریں گے۔ اس لیے زیادہ خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ نے خفگی دکھائی تو پھر ٹھیک ہے!" وہ بڑے بے نیاز انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

"میں بھی نہیں دکھاؤں گی۔"

اس کے اسٹائل پر مجھے ہنسی آ گئی۔ "اچھا جاؤ، لے کر آؤ۔" وہ بے نیازی ختم کر کے فوراً اندر بھاگی۔ چند لمحوں بعد دوبارہ نمودار ہوئی تو ہاتھ میں ایک کاپی تھی۔

"یہ...... اتنے اچھے نہیں ہیں۔" اس نے قدرے تذبذب سے کاپی میری جانب بڑھائی۔

وہ جنہیں چار تصویریں کہہ رہی تھی، وہ تقریباً 20 کے قریب تھیں اور بہت اچھی تھیں۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ وہ اینجلو ٹائپ کا آرٹ نہیں تھا، مگر اس کی عمر کے لحاظ سے اس نے کافی اچھا بنا لیا تھا۔

اس کی پینٹنگز دیکھ کر مجھے بے اختیار کچھ یاد آیا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی ہیں مومو! بہت زیادہ، تم کوئی آرٹ اکیڈمی کیوں نہیں جوائن کر لیتیں؟"

میں نے اسے مشورہ دیا، مگر اس کا ایسا ارادہ نہیں تھا۔

"سر! ابھی میرا میٹرک تو ختم ہو جائے۔ یہ پینٹنگ وغیرہ تو ساری عمر ہوتی رہے گی۔" اس نے بات ہی ختم کر دی۔

میں اس کے اندر کے مصور کو باہر نکالنا چاہتا تھا، اس لیے میرے اصرار پر اس نے اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر اسکیچز بنانے شروع کر دیئے۔ میں نے اسے کئی دفعہ کہا کہ وہ میرا اسکیچ بنائے، مگر وہ ٹال جاتی۔

* * *

اس کے کیمسٹری کے پریکٹیکل سے پچھلی شام میں اس کی طرف معمول سے قدرے پہلے آ

گیا۔ پیپرز میں، میں اسے ٹیوشن نہیں پڑھاتا تھا، اس لیے اب کافی دنوں بعد آج آیا تھا کہ دیکھ لوں، اسے کوئی مسئلہ نہ ہو۔

ویسے مجھے علم تھا کہ اس کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ آج بھی ماضی پر نگاہ ڈالوں تو سوچتا ہوں کہ روزانہ شام کی وہ ایک گھنٹے کی ٹیوشن تو محض ایک فارمیلیٹی تھی۔ ورنہ وہ زمانہ ٹیوشنز کا ہرگز نہ تھا۔ مجھے اور موموکو روز شام میں ایک ساتھ بیٹھنے کی اتنی عادت ہوگئی تھی کہ اب، ہم بھولے سے بھی ٹیوشن ختم کرنے کا نہیں سوچتے تھے۔

اوہ میں بھی بات کرتے کرتے کدھر نکل جاتا ہوں، بوڑھا ہوگیا ہوں نا، بڑھاپا انسان کو قدرے سنکی کر دیتا ہے۔ اب تو یادداشت بھی نہیں رہی۔ اس لیے کہاں سے کہاں نکل جاتا ہوں۔

خیر، میں آپ کو مہر النساء کی کہانی سنا رہا تھا اور شاید اس کے کیمسٹری کے پریکٹیکل سے پچھلی شام کا تذکرہ کر رہا تھا۔

''سر......! آپ اتنے دنوں بعد!'' وہ کچن میں کرسی پر بیٹھی سیب کھا رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہاں بھئی تیاری ہوگئی پریکٹیکل کی؟'' میں بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ''کاپی کمپلیٹ ہے؟ میڈم کے سائن کرا لئے ہیں؟''

''جی سر! سب کچھ کمپلیٹ ہے۔ آپ یہ سیب لیں نا!'' سیبوں کی پلیٹ میری جانب کھسکا کر وہ فریج کی طرف بڑھی۔

''میں نے تو پیپرز سے بھی پہلے سائن کرا لیے تھے۔'' فریج میں سے انگوروں کا لفافہ نکالتے ہوئے وہ بتانے لگی۔

''ویٹس گڈ!'' میں نے سیب کی قاش منہ میں رکھی۔

تمام انگور اس نے ٹوکری میں ڈال کر سنک کے آگے رکھے اور پھر اچھی طرح دھو کر اور پانی نتھار کر میرے سامنے پر رکھ دیئے۔ اس کو علم تھا کہ میں سیب سے زیادہ انگور شوق سے کھاتا ہوں۔

''لیں نا، سر!'' اس نے ایک صاف پلیٹ بھی میرے سامنے رکھی۔

''لیتا ہوں۔ تم ذرا ایک دفعہ مجھے پریکٹیکل نوٹ بک دکھا دو، میں اپنی تسلی کرلوں!'' میں انگوروں کے گچھے سے انگور توڑنے لگا۔

''وہ تو سر۔'' اس نے قدرے ہچکچاہٹ سے مجھے دیکھا۔

''وہ صدف نے مجھ سے مانگ لی تھی، اس کو کچھ ڈائیگرامز بنانی تھیں۔''

''موموا!'' میں نے بے یقینی سے موموکو دیکھا۔ ''تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ تم نے کاپی صدف کو کیوں دے دی؟ کوئی پیپر سے پچھلے دن بھی کاپی دیا کرتا ہے؟'' مجھے اس کی نرم دلی پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ ''کل اگر وہ کاپی نہ لائی اور تمہارا کوئی سخت قسم کا ایگزامینر آ گیا تو وہ تمہیں فیل کر دے گا۔''

''وہ لے آئے گی سر! اس بے چاری نے چند ڈائیگرامز بنانی تھیں۔''

''سارا سال کیوں نہ بنائیں اس نے ڈائیگرامز؟''

''اس کی کوئی مجبوری ہوگی سر!'' وہ مطمئن تھی۔

''اور اگر وہ نہ لائی تو؟ تم کیا کرو گی پھر؟'' مجھے اس پر بہت غصہ آیا تھا۔

مومو نے ایک لمحے کو خاموشی سے میرا چہرہ دیکھا، پھر بولی۔

''سر! جب اس نے کہا کہ وہ لے آئے گی تو وہ لے آئے گی۔ دنیا اتنی بھی بے اعتبار نہیں ہوئی، آپ یوں خوامخواہ ہر کسی پر شک نہ کیا کریں۔''

میں نے اسے چونک کر دیکھا۔ ''شک؟ میں بھلا کب شک کرتا ہوں؟''

''سر آپ اپنے علاوہ کسی کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے، آپ کو ہر بندے پر شک ہوتا ہے کہ وہ آپ کو دھوکا دے گا، حتیٰ کہ مجھ پر بھی۔'' وہ بہت آرام سے انگور کھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''اسی لیے کہہ رہی ہوں، یوں شک نہ کریں وہ لے آئے گی۔''

مومو کی بات درست نکلی، اس کی کلاس فیلو صدف واقعی اگلے دن کاپی لے آئی۔ یہ ایک چھوٹی سی، غیر اہم بات تھی، مگر اس چھوٹی سی غیر اہم بات نے مجھ پر یہ انکشاف کیا کہ مجھے اس دنیا میں...... کسی پر اعتبار نہیں، حتیٰ کہ مومو پر بھی نہیں۔

* * *

اس روز تو معجزہ ہی ہوگیا۔

صبح چھ بجے کے قریب، جب میں اپنے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر موجود پارک میں پتھریلی روش پر جاگنگ کر رہا تھا، مجھے سامنے سے مومو آتی دکھائی دی۔

''ہیلو سر'' میرے مخالف سمت سے آتی، بلیو جینز اور شرٹ میں ملبوس مومو نے ہاتھ ہلاتے ہوئے بھاگ کر میرے اور اپنے درمیان موجود فاصلہ طے کیا، پھر میرے پاس پہنچ کر رخ اس طرف کرلیا، جس طرف میں بھاگ رہا تھا۔

''وعلیکم ہیلو لٹل گرل!'' میں اسے اپنے بائیں جانب بھاگتے دیکھ کر بے اختیار مسکرایا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم جاگنگ کرنے لگی ہو۔''

میری دائیں جانب گھاس پر چند لڑکے بیٹھے ایکسرسائز کر رہے تھے۔ چند خواتین بھی معمول کے مطابق واک کر رہی تھیں، پارک میں روزانہ کی طرح رونق تھی، مگر مجھے صحیح معنوں میں رونق آج لگی تھی، کیا مجھے وجہ بتانے کی ضرورت ہے؟

''صبح جلدی اٹھنا بہت مشکل کام ہے سر! مجھے نہیں لگتا کہ میں اسے جاری رکھ پاؤں گی۔'' وہ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے ہی ہانپ گئی تھی۔

''آپ کو اکیلے بھاگنا ہے تو شوق سے بھاگیں، ورنہ مجھے جوائن کرلیں، وہ ایک بنچ کی جانب بڑھتے ہوئے بولی تو میں بھی اس کے پیچھے آ گیا۔

''تم میری روٹین خراب کر رہی ہو لڑکی! اتنی ینگ ہو اور ایک چکر بھی نہیں لگایا اور میں تم سے عمر میں اتنا بڑا ہوں، پھر بھی روز یہاں کے آٹھ چکر لگاتا ہوں۔''

''ارے سر! بندے کا دل جوان ہونا چاہیے، عمر سے کیا ہوتا ہے۔'' اس کے انداز میں لاپروائی تھی، پھر تنفس بحال کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''گھر جا رہی ہوں، کالج بھی جانا ہے۔''

وہ ان دنوں فرسٹ ائیر میں تھی۔

''یوں کرو، میرے گھر چلو اور کافی پیو۔'' کافی اور کتابوں کے معاملے میں میرا اور مومو کا ذوق ایک سا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے!'' واپسی پر ہم بھاگنے کے بجائے چل رہے تھے۔ اب وہ میرے دائیں جانب تھی۔ میں نے ایک نظر اس کو دیکھا۔ وہ مجھ سے کتنی چھوٹی، کتنی نازک سی تھی۔ اس کا سر میرے کندھے سے بھی نیچے آتا تھا۔

''ایک بات پوچھوں سر؟'' قریب لگے ایک درخت کی ٹہنی سے پتا توڑ کر دونوں ہاتھوں میں لیے، وہ اس کے ٹکڑے کرنے لگی۔

''اجازت کیوں مانگ رہی ہو؟''

''اس لیے کہ کہیں آپ مائنڈ نہ کر جائیں۔'' اس نے ایک گہری سانس بھری۔

''پوچھو۔''

''آپ کو نائمہ آنٹی یاد ہیں؟''

میں نے نظر اٹھا کر حیرت سے اس غیر متوقع سوال پر اسے دیکھا۔ وہ پتے کے ٹکڑے کرتے ہوئے انہیں روش پر پھینک رہی تھی۔

''ہاں تھوڑی بہت!''

''سر! آپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ آپ نے منگنی کیوں توڑی تھی؟''

اس کا سر جھکا ہوا تھا اور نگاہیں پتے پر تھیں، جواب تک آدھا رہ گیا تھا۔

''میں بہت امیر نہیں ہوں مومو اور میری ہمراہی میں اس کی بہت سی خواہشات تشنہ رہ جاتیں۔ اس کے پاس مجھ سے بہتر چوائس تھی۔''

''یعنی اب آپ کے دل میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟'' وہ ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں اور ایسی بات سوچنی بھی نہیں چاہیے۔ وہ اب میرڈ ہے۔''

کل دادو نے مجھے بتایا کہ ان کے ہزبینڈ نے ان کے بچے چھین کر ان کو طلاق دے دی ہے۔''

''واٹ؟'' میں نے رک کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''مگر کیوں؟''

''وہ ان کے کریکٹر پر شک کرتا تھا۔'' مومو سر جھکائے بتا رہی تھی، میرے تھمے قدم چلے تو وہ بھی ساتھ چل دی۔ ''وہ اب واپس آ گئی ہیں، اب آپ......؟''

''وہ چیپٹر کلوز ہو چکا مومو! وہ ایک بے وفا عورت تھی اور ہے، میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر بے وفائی نہیں۔'' میری بات پر اس نے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں ''اوکے سر'' کہہ دیا۔

پارک سے نکل کر مومو نے اپنے سائیکل کو ان لاک کیا، پھر دونوں ہاتھ اس کے ہینڈلز پر رکھ کر اسے ساتھ چلاتے ہوئے پیدل میرے ہمراہ میرے گھر کی جانب چل پڑی۔

''آپ کی اس گھر کے ساتھ کوئی پرانی دشمنی چل رہی ہے کیا؟'' میرے لونگ روم میں

کھڑے ہو کر کافی دیر تک اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے بے حد معصومیت سے پوچھا تھا۔

لونگ روم کے صوفوں کا کپڑا میلا ہو رہا تھا، سینٹر ٹیبل پر رات کے کھانے کے برتن جوں کے توں رکھے تھے، لونگ روم سے ملحقہ اوپن کچن کے کاؤنٹر پر تولیہ بھی پڑا تھا۔ میں نے قدرے شرمندگی سے اسے دیکھا۔

"سوری چھوٹی لڑکی! مگر میں ایسے ہی رہتا ہوں۔"

وہ لونگ روم میں رکھے برتن اٹھا کر کچن میں بنے سنک میں رکھنے لگی۔

"میں ذرا چینج کر آؤں، تم بیٹھو۔" اس کو وہیں چھوڑ کر میں آفس کے لیے تیار ہونے چلا گیا، تھوڑی دیر بعد نہا دھو کر تولیے سے بال رگڑتے ہوئے نکلا تو یکدم اپنے بیڈروم کی دہلیز پر رک گیا۔

لونگ روم کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ تمام چیزیں سلیقے سے رکھی تھیں، ان ڈور پلانٹس کو پانی دے کر ان کی جگہیں تبدیل کر دی گئی تھیں، میلے برتن اب چمکتے دمکتے اپنی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لونگ روم میں آیا۔ مجھے مومو دائیں جانب کچن میں چولہے کے آگے کھڑی دکھائی دی تھی۔ آہٹ پر وہ مڑی۔ "آ گئے آپ؟ چلیں ناشتہ کر لیں۔"

اس نے چولہا بند کر کے فرائنگ پین سے تلے ہوئے انڈے پلیٹ میں نکالے، دوسری پلیٹ میں توس رکھے اور کافی کے دو بھاپ اڑاتے مگوں کے ساتھ سلیقے سے ٹرے میں سجا کر لونگ روم میں لے آئی۔

"یہ زیادہ شوگر والی آپ کی اور یہ کم شوگر والی میری۔" مجھے میرا کپ تھما کر وہ مزے سے بولی۔

"اتنی سی دیر میں تم نے یہ سب کیسے کر لیا؟" میری حیرت پر وہ مسکرائی اور شانے اچکا دیئے۔

"بس کر لیا۔"

اس روز پتا نہیں کتنے عرصے بعد میں نے ذائقے دار ناشتہ کیا تھا، جو مزہ اور ذائقہ مومو کے تلے ہوئے انڈے میں تھا، وہ مجھے پوری دنیا میں سیون اسٹار ہوٹلز سے لے کر ڈرائیور ہوٹلز تک کہیں نہیں ملا تھا۔

اس کے بعد اکثر ہی وہ جاگنگ کے بعد میرے ساتھ گھر آ جاتی اور نہ صرف یہ کہ میرے لیے ناشتہ بناتی بلکہ کبھی کبھی تو پورے ہفتے کے کپڑے بھی استری کر جاتی۔ پہلے کپڑے میں استری

کرتا تھا، برتن خود دھوتا تھا، نوکر بھی رکھے نہیں کہ ان پر بھروسہ نہ تھا۔ صفائی البتہ ہفتے میں تین دن مسز کمال کی نوکرانی آ کر کر جاتی تھی۔ ورنہ تو میں کھانا بھی (بد مزہ ہی سہی) خود ہی بناتا تھا۔ لیکن پھر مومو نے میرا ہر کام نامحسوس انداز میں اپنے ذمے لے لیا تو وہ تو میرے پودوں تک کا خیال رکھتی تھی۔

اور پھر ایک دفعہ تو وہ ہفتے بھر کے لیے کسی شادی میں شرکت کرنے کے لیے کراچی چلی گئی۔

اس پورے ہفتے میں، مومو پر بے حد انحصار کرنے کے بعد میں تو بالکل مفلوج ہو چکا تھا، کافی عرصے تک کچن سے دور رہنے کے باعث میں تو انڈے تلنا بھی بھول چکا تھا۔ میرے جوتے، موزے، ٹائی، سب کچھ مومو رکھنے لگی تھی۔

اس ایک ہفتے میں مومو مجھے بہت یاد آئی تھی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس چھوٹی سی لڑکی کی میری زندگی میں کتنی اہمیت ہے۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ اب وہ آئے گی تو اس سے کہہ دوں گا کہ میرے کام نہ کیا کرے، تاکہ میں اس کی غیر موجودگی میں مفلوج ہو کر نہ رہ جاؤں، مگر جب وہ ہنستی مسکراتی لڑکی واپس آئی تو میں نے کچھ بھی کہنے کا ارادہ بدل ڈالا۔ اگر وہ میرا کام کر ہی دیتی تھی تو اس میں میرا فائدہ اور اس کی خوشی تھی۔ میں نے اسے مجبور تو نہیں کیا تھا۔ آخر میں بھی اسے ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ میرے اندر کے خود غرض انسان نے مجھے اس سے کچھ بھی کہنے نہ دیا۔

* * *

"مومو تو کچن میں حیدر کے لیے سوپ بنا رہی ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا۔ تم بیٹھو، میں مومو کو بلاتی ہوں۔"

مجھے لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر آنٹی جو حیدر کے کمرے سے نکل رہی تھیں، شفقت سے مسکراتے ہوئے کہہ کر کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

میں حیدر کے متعلق پریشان سا ہو کر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ تکیوں کے سہارے، آنکھیں موندے بستر پر نیم دراز تھا۔ دستک پر آنکھیں کھول دیں، مجھے دیکھ کر نقاہت سے مسکرایا۔

"آؤ حسان!"

"کیا حال بنایا ہے حیدر!" میں تاسف سے اس کے پژمردہ اور کمزور چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کے بیڈ کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''ارے کچھ نہیں، معمولی سا بخار ہے، مگر میری والدہ محترمہ اور......'' اسی پل میں ہاتھ میں ٹرے لیے مومو اندر داخل ہوئی تھی۔

اسی کو دیکھ کر حیدر کے لبوں پر فخریہ مسکراہٹ بکھر گئی۔'' اور مس مہر النساء نے ہوا بنا کر رکھ دیا ہے۔''

''السلام علیکم سر!'' اس نے میز پر ٹرے رکھی اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر پیالے اور چمچے سیٹ کرنے لگی۔'' ہوا کسی نے نہیں بنایا پاپا! آپ بیمار ہیں اور مومو بیماروں کے ساتھ ایسے ہی کرتی ہے!''

وہ بڑے من مانے انداز میں کہہ رہی تھی، اس کے لمبے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ آج اس نے کڑھائی والی پوری آستین کی قمیص شلوار پہن رکھی تھی اور کندھوں پر لمبا سا دوپٹہ پھیلایا ہوا تھا۔ آج وہ مجھے بڑی بڑی اور پہلے کی نسبت مختلف لگی تھی۔

''میری بیٹی بہت کیئرنگ ہے، جہاں جائے گی، محبتیں اور خلوص بانٹے گی۔'' حیدر فخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

میں نے شرارت سے مسکرا کر مومو کو دیکھا۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح شرمائی یا گھبرائی نہیں، بلکہ پورے اعتماد سے مسکرائی تھی۔

''ہماری مومو ہر معاملے میں بہترین ہے۔'' میں نے بھی حیدر کی تائید کی۔

مومو نے ایک پیالہ حیدر کو تھمایا، جس نے سیدھے ہو کر ٹیک لگائی اور دوسرا پیالہ اس نے میری سائیڈ والی ٹیبل پر رکھا۔

میں نے ایک چمچہ سوپ کا لیا، اس میں ساسز کم تھے۔ غالباً وہ حیدر کے غذائی اعتبار سے بنایا گیا سوپ تھا۔ میں نے خاموشی سے دوسرا چمچہ لے لیا، حالانکہ میں تیز قسم کی چلی ساس ڈالنے کا عادی تھا۔

''یہ چلی ساس، سر!'' مومو نے چلی ساس کی بوتل چند لمحوں بعد مجھے لا کر دی اور پھر خود ہی چند قطرے ڈال کر بوتل ٹرے میں رکھ دی، میں اسے بس دیکھ کر رہ گیا۔ پتہ نہیں اسے کیسے ہر بات کا بغیر کہے علم ہو جاتا تھا۔

ہم دونوں کو سوپ سرو کر کے وہ حیدر کے سرہانے آ کر بیٹھ گئی۔'' پاپا! ایک مشورہ دوں؟

آپ شادی کر لیں۔''

''مومو!'' حیدر کے لہجے میں خفگی تھی۔

''پاپا کر لیں نا شادی، میری فرینڈ کی بڑی بہن ہے، سارہ اتنی کیوٹ اور سویٹ ہے نا وہ، اس کو ہر کام آتا ہے۔ آپ کے لیے پرفیکٹ ہے۔'' وہ بڑے جوش سے بتا رہی تھی۔

''عمر کیا ہے؟'' حیدر نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے سوپ کا پیالہ سائیڈ پر رکھا۔

''نائنٹین کی ہے؟'' مومو نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

جواب میں حیدر نے اسے گھور کر دیکھا۔'' مس مہر النساء، بیمار میں ہوں اور دماغ آپ کا چل گیا ہے؟''

''کیا ہوا پاپا؟'' وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

''مہر النساء بی بی!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ حیدر اور مجھے جب بھی اسے چھیڑنا ہوتا، ہم اسے مہر النساء کہہ کر پکارتے تھے۔

''آپ ایک غلط بات کر رہی ہیں۔ وہ لڑکی انیس سال کی ہے اور آپ کے والد ماجد چالیسویں سن کو کراس کر چکے ہیں۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے سر! بندے کا ذہن ملنا چاہیے۔''

''بہت کچھ ہوتا ہے مومو! عمر سے ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔'' حیدر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''میں ایک شادی کر چکا ہوں، میری ایک جوان بیٹی ہے، اگر ان لوگوں کو دولت کا لالچ نہ ہو تو، وہ کیوں اس کی شادی مجھ سے کریں گے؟''

''پر آپ اتنے ینگ لگتے ہیں اور آپ اتنے ہینڈسم بھی ہیں......'' وہ بحث کرنے کے موڈ میں تھی۔

''ینگ لگنے اور ہینڈسم ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ عمروں کے فرق کبھی نہیں مٹتے مومو!'' میں نے حیدر کی تائید کی۔

''ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چالیس برس کی عمر میں بہت کم عمر حضرت عائشہؓ سے شادی کی تھی اور وہ ایک مثالی شادی تھی۔'' اس کی بات پر میں لاجواب سا ہو گیا۔

''وہ اور بات تھی۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں، میری بات یاد رکھنا مومو! جو چیزیں غیر فطری

ہوتی ہیں، وہ ایک دن ختم ہو کر اپنی سابقہ پوزیشن پر آجاتی ہیں۔"

حیدر کا لہجہ دوٹوک تھا۔ مومو نے مدد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا، مگر میں نے شانے اچکا دیئے۔ وہ مایوس سی ہو کر اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

* * *

میں اتوار کے روز مومو کو ٹیوشن پڑھانے نہیں جاتا تھا، مگر اس اتوار آنٹی نے بصد اصرار مجھے چائے پر انوائٹ کیا تھا، وہ مجھے کچھ لوگوں سے ملوانا چاہتی تھیں۔

میں پانچ بجے کے قریب وہاں چلا گیا۔

ڈرائنگ روم میں حیدر اور آنٹی کے علاوہ ایک خوش شکل مرد کے ہمراہ ایک خوبصورت سی ستائیس اٹھائیس سالہ لڑکی بیٹھی تھی۔

"یہ میرا کزن ہے حسان! ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا ہے۔" حیدر نے میرا تعارف ان سے کرایا۔ "اور یہ حسان! یہ میرا دوست اور بزنس پارٹنر بابر ریاض ہیں اور یہ ان کی بہن مس تانیہ ریاض ہیں۔ پروفیشن کے اعتبار سے آرکیٹیکٹ ہیں اور ہمارے اگلے پروجیکٹ میں ان کی خاطر خواہ مدد ہمارے ساتھ ہوں گی۔"

میں نے ایک رسمی مسکراہٹ اس کی جانب اچھال دی، مجھے ان سے ملاقات کا کچھ کچھ مقصد سمجھ میں آ رہا تھا اور یقیناً آپ کو بھی آ رہا ہوگا۔

وہ لوگ جتنی دیر بیٹھے رہے، میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ جس صوفے پر حیدر بیٹھا تھا، اس کے پیچھے دیوار کی جگہ قد آور فرنچ ونڈو تھی، جس نے پوری دیوار کی جگہ گھیر رکھی تھی۔ کھڑکی کے شفاف شیشے کے اس پار مجھے لان دکھائی دے رہا تھا، مومو وہاں کھڑی حلیمہ کو کوئی کام کہہ رہی تھی۔ آج اس نے بہت پیاری سی پنک کلر کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ دوپٹہ نسبتاً چھوٹا تھا اور گلے میں جھول رہا تھا۔ قمیص کے آستین بھی بہت چھوٹی تھی، جو اس پر بہت اچھی لگتی تھی۔

مہمانوں کے سامنے وہ چائے اور دیگر لوازمات سرو کرتے وقت ہی آئی، مجھے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس نے غالباً مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے سلام کر کے وہ فوراً اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی براؤنیز کی ایک پلیٹ کے ساتھ ہوئی۔

"میں نے بنا کر رکھی تھیں، آپ کے لیے، مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ آئے ہوئے ہیں ورنہ

پہلے لے آتی۔" ٹرالی میں میرے سامنے براؤنیز کی پلیٹ رکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا، میں زیرلب مسکرایا۔

آنٹی میرے قریب ہی بیٹھی تھیں، براؤنیز کی پلیٹ دیکھ کر انہوں نے مومو کو گھورا، وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔ آنٹی نے آہستہ سے مجھے مخاطب کیا۔

"کب سے کہہ رہی ہوں حلیمہ سے، براؤنیز بھی ساتھ لے آئے، مگر وہ کہہ رہی تھی مومو بی بی نے براؤنیز کو ہاتھ بھی لگانے سے منع کیا ہے۔ اب سمجھ میں آیا، تمہارے لیے رکھی تھیں۔ مجھ سے پہلے پوچھ لیتی میری لاڈو، تمہارے سر کو تو صبح ہی میں انوائیٹ کر چکی تھی۔"

اس نے براؤنیز صرف میرے لیے بنائی تھیں، کیونکہ میں وہ بہت شوق سے کھاتا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تھینک یو لٹل گرل۔" یہ پہلی بار تھا، جب میں نے مومو کو تھینک یو بولا تھا، ورنہ ہمیشہ اس کی ہر خدمت کو میں فار گرانٹڈ لیتا تھا۔

میرے شکریے پر وہ مسکرائی۔

وہ لوگ چلے گئے تو حیدر بھی اٹھ گیا۔ اس کو کوئی ضروری کام تھا، حلیمہ برتن اٹھانے لگی۔ مومو قدرے تساہل سے میرے اور آنٹی کے ساتھ بیٹھ گئی۔

حلیمہ چلی گئی تو آنٹی نے مجھے مخاطب کیا "تمہیں تانیہ کیسی لگی؟"

"ہوں......اچھی تھی۔" میں نے گویا انجان بن کر کہا۔

"تانیہ اور بابر حال ہی میں پاکستان شفٹ ہوئے ہیں۔ بابر کالج کے زمانے سے حیدر کا دوست ہے۔ اس کے رشتہ داروں میں تانیہ کے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں۔ بلکہ سچ کہوں تو اس کے رشتہ دار خاصے لالچی واقع ہوئے ہیں۔ اس نے حیدر سے تانیہ کے رشتے کے لیے کہا تھا۔ میرے اور حیدر کے ذہن میں صرف تمہارا نام آیا تھا۔ بولو، تم کیا کہتے ہو؟"

میں نے لمحہ بھر کو سوچا۔ "سوچ کر بتاؤں گا، ویسے لوگ اچھے ہیں۔"

"اچھے کیا بہت اچھے ہیں، کینیڈا میں ان کا گھر سبین کے گھر کے بہت قریب تھا۔" آنٹی نے اپنی بھانجی سبین کا نام لیا، جو پچھلے کئی سالوں سے کینیڈا میں مقیم تھی۔

سبین بتاتی ہے۔" تانیہ بہت اچھی اور شریف لڑکی ہے۔ ایشیائی کھانوں کی ماہر ہے اور

بہت کلچرڈ ہے۔ وہ تو رشتے کی بات سن کر اتنی خوش ہوئی، کہتی تھی، میرا کوئی بھائی نہیں ہے ورنہ میں تانیہ کو اس کے لیے مانگ لیتی۔ بیٹے بھی میرے چھوٹے ہیں۔ آپ حسان کے لیے لے لیں اسے۔''

میں بے اختیار مسکرایا۔ سبین سے میرا براہ راست کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ حیدر کی کزن تھی، پھر بھی ہماری بات چیت ہوتی رہتی تھی۔

''کیسی ہے سبین؟''

''بالکل ٹھیک ہے، ماشاء اللہ دو بچے ہیں اس کے۔ ابھی حال ہی میں اس کے شوہر نے بہت بڑا گھر لیا ہے۔ مجھ سے کہتی ہے، آپ اور مومو میرے پاس آ جائیں، میرا اتنے بڑے گھر میں دل نہیں لگتا۔''

''ارے نہیں آنٹی! مومو کو کینیڈا مت لے کر جائیں، میں بالکل مفلوج ہو کر رہ جاؤں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے مومو کو دیکھا، جو ہمارے سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ میری بات پر مسکرائی نہیں، بس بہت خاموش نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی بھنویں تنی ہوئی تھیں اور وہ بالکل چپ تھی۔

''میں ذرا کچن کو دیکھوں۔'' آنٹی کسی کام کو یاد کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے مومو کو دیکھا۔ وہ بالکل اسی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے کچھ الجھن ہوئی۔

''مومو!''

''تو آپ دادو کو سوچ کر بتائیں گے اور...... آپ کو وہ لوگ اچھے لگے ہیں!'' وہ ایک دم بہت کاٹ دار لہجے میں بولی، اس کی آواز میں دبا دبا غصہ تھا۔

''تانیہ اور بابر کی بات کر رہی ہو؟'' مجھے اس کے رویے پر حیرت ہوئی۔

''تو آپ دادو کو سوچ کر بتائیں گے۔'' وہ اسی دوٹوک انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے مومو؟'' میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''تو آپ شادی کر رہے ہیں؟'' اس کی آواز میں غصہ بھی تھا اور صدمہ بھی۔

''ہاں کرنی تو ہے نا! تو کر رہا ہوں، مگر تمہیں کیوں غصہ آ رہا ہے؟'' میں اس کے رویے کی

وجہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

کتنی ہی دیر وہ زخمی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ ''سر! سر! آپ کو وہ لڑکی نظر آ گئی، جس کو آپ جانتے تک نہیں اور......'' اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ ''اور ساڑھے پندرہ برس سے مومو کہیں نظر نہیں آئی، آپ کو؟ آج آپ مجھے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر رہے ہیں؟'' میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''مومو!'' میں اتنی زور سے گرجا، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر لڑھکنے لگے تھے۔

''تمہارا...... تمہارا دماغ درست ہے؟ تمہیں پتہ ہے تم نے کیا بات کی ہے؟'' میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا، مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''مجھے پتہ ہے، میں نے صرف یہی کہا ہے کہ آپ مجھے چھوڑ کر اس تانیہ ریاض سے شادی کیوں کر رہے ہیں؟ کیا وہ مجھ سے بہتر ہے؟'' اس کا لہجہ شاکی تھا۔

وہ اتنی آسانی سے وہ بات کر رہی تھی، جس کا تصور میں نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔

''شٹ اپ مومو! جسٹ شٹ دی ہیل اپ!'' میں نے بے اختیار دروازے کو دیکھا۔

''اگر کسی نے تمہاری بکواس سن لی تو میں......؟ میرے خدا میں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور تم...... اوہ گاڈ!'' بے یقینی، دکھ، صدمہ، استعجاب کے مارے میرے منہ سے کچھ نکل ہی نہیں رہا تھا۔

''ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے؟ آپ مجھے ساڑھے پندرہ سالوں سے جانتے ہیں۔ میرے کان میں اذان آپ نے دی تھی سر؟ آپ تو مجھ سے واقف ہیں۔ آپ نے تو کہا تھا، آئی لو یو مومو! اور اب؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو ایک دفعہ پھر گرنے لگے تھے۔ ''اور اب کیا میں اتنی بری ہوں کہ آپ مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟''

''بات برے اور اچھے کی نہیں ہے مومو! میں بھلا کیسے تم سے شادی کر سکتا ہوں؟ گاڈ!'' مجھے وہ فقرہ کہتے ہوئے بھی برا لگ رہا تھا۔ ''ہمارے درمیان ایک ٹیچر اور اسٹوڈنٹ سے بڑھ کر کوئی ریلیشن نہیں اور مجھے تم سے بہت محبت ہے، مگر ایک چھوٹی سی دوست کی طرح لیکن تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی، بغیر کچھ سوچے سمجھے۔ اگر حیدر کو علم ہو گیا تو...... تم جانتی ہو، میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں۔''

وہ ایک دم کھڑی ہو کر میرے سامنے آئی۔ ''باپ کی جگہ؟'' اس نے غصے سے کہا تھا۔ ''کیا

کہا آپ نے؟ آپ میرے باپ کی جگہ ہیں؟ ان ساڑھے پندرہ برسوں میں کب آپ نے مجھے بیٹا کہا؟ کب مجھے "مائی چائلڈ" کہہ کر مخاطب کیا؟ کب کہا کہ میں تمہارا باپ ہوں؟ آپ میرے باپ ہیں، نہ باپ کی طرح ہیں۔ باپ صرف ایک ہوتا ہے، جو میرا آل ریڈی ہے۔"

"استاد بھی باپ ہوتا ہے مومو!" میں ڈپٹ کر بولا، مگر وہ اسی نڈر آواز میں میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھی۔ "بہت سے ٹیچرز اور اسٹوڈنٹس آپس میں شادی کر لیتے ہیں تو دنیا کیا ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے؟ نہیں نا! یہ منہ بولے رشتے کچھ نہیں ہوتے اور ہمارے درمیان تو کوئی منہ بولا رشتہ ہے بھی نہیں۔"

"تم......!" شدید صدمے اور بے یقینی کی حالت میں، میں مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ "تم پاگل ہو گئی ہو۔ اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ تمہاری عمر ہے، شادی کی بات کرنے کی؟ افسانوں اور ناولوں نے تمہارے ذہن میں فتور ڈال دیا ہے۔ اپنی عمر دیکھو اور اپنی باتیں دیکھو۔ تم تو سولہ برس کی بھی نہیں ہوئیں اور میں تم سے بائیس سال بڑا ہوں۔"

"عمر سے کچھ نہیں ہوتا، سر!" اس نے دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے۔

"بہت کچھ ہوتا ہے، تم الیکٹرا کمپلیکس کا شکار ہو۔"

"الیکٹرا کمپلیکس؟ وہ کیا ہوتا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک چھوٹی سی نفسیاتی بیماری جو کچھ لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ دراصل یہ ایک لڑکی کا، اس کی ماں سے حسد کا نام ہے۔"

"ماں سے...... حسد؟" اس نے خائف سی ہو کر مجھے دیکھا، یک دم مجھے احساس ہوا، مومو نے تو ماں کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

"دراصل جو لڑکیاں ذہنی طور پر جلد مچیور ہو جاتی ہیں، ان کے اندر ففٹی پلس مردوں کے لیے ایک پسندیدگی ڈیولپ ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی عمر کے مردوں میں بیک وقت محبوب اور باپ دونوں کی تلاش کرتی ہیں۔ ایسی لڑکی کی شادی اگر اس کی عمر کے لڑکے سے کر دی جائے تو وہ ذہنی سطح نہ ملنے کے باعث ناکام ہو جاتی ہے۔

الیکٹرا کمپلیکس ادھر ہی ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ جب وہ لڑکی تیس پینتیس برس کی عمر کو پہنچتی ہے تو معاملہ الٹ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے سے آدھی عمر کے لڑکوں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتی ہے۔ تم نے

ضرور آنٹیوں ٹائپ خواتین کو ینگ سے سیکرٹری رکھ کر، ان کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا ہو گا تو یہی الیکٹرا کمپلیکس ہوتا ہے۔"

وہ ہکا بکا سی میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"تو آپ، آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے؟"

"پھر وہی شادی!" میں چکرا کر رہ گیا۔ "میں مر کر بھی تم سے شادی نہیں کر سکتا، میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں یا اللہ! میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" دکھ کے مارے مجھ سے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"میں تو سمجھتی تھی آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔" اس کی لانبی پلکیں ایک دفعہ پھر بھیگ گئیں۔ "جیسے میں آپ سے کرتی ہوں۔"

"بچوں والی باتیں مت کرو۔ مومو! جس کو تم محبت سمجھ رہی ہو، وہ صرف ایک وقتی اور جذباتی اٹریکشن ہے۔ ذرا بڑی ہو گی تو تمہیں اس فضول اور احمقانہ خیال پر ہنسی آئے گی۔" میرا لہجہ غصیلا اور بے حد روکھا تھا۔

"آپ میری محبت کو فضول اور احمقانہ کہہ رہے ہیں۔" اس نے دکھ سے میرا چہرہ دیکھا۔

"یہ محبت نہیں ہے مومو! یہ جذباتی اٹریکشن ہے۔ تمہیں بڑی عمر کا مرد اچھا لگتا ہے، کیونکہ تمہیں باپ کی محبت نہیں ملی۔ سارا قصور ہی حیدر کا ہے۔ اس نے تمہیں کبھی محبت دی ہی نہیں۔ اس لیے تم اپنے باپ کی عمر کے ہر آدمی میں اپنا باپ تلاش کرتی ہو...... جانتی ہو میں روز تمہارے پاس کیوں آتا تھا؟ کیونکہ میں دیکھتا تھا حیدر تمہیں اگنور کرتا ہے۔ میں چاہتا تھا، تمہاری ذات میں کہیں کوئی کمی، کوئی خلش نہ رہ جائے۔ اس لیے میں تمہیں توجہ دیتا تھا، مگر تم نے کتنا الٹ مطلب لیا، میری محبت کا، مومو! تم نادان ہو اور تم بے وقوف ہو۔"

"ہاں میں ہوں، میں نادان ہوں، میں بے وقوف ہوں، مگر میں نے اس دنیا میں سب سے زیادہ آپ سے محبت کی ہے...... آپ سے سر! لیکن...... لیکن آپ کے خیال میں میں نفسیاتی مریض ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے سر کو تھامے صوفے پر گر سی گئی۔

"آپ کو میں ذہنی بیماریوں کا شکار لگتی ہوں۔ میری آپ کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں

ہے۔'' اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ '' آپ کو میں ہمیشہ غلط اور جھوٹی لگتی ہوں۔'' اس نے سر اٹھا کر آنسوؤں سے لبریز شکوہ کناں آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

'' مجھے پچھتاوا ہو رہا ہے کہ کیوں میں نے ساڑھے پندرہ برس تم پر ضائع کیے۔'' میری بات پر وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

'' تم ایسی نکلو گی، کاش مجھے علم ہوتا۔ آئی ہیٹ یو مومو۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔'' میں نے میز سے چابی اٹھائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ غصے، دکھ اور اضطراب سے میری عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اگر حیدر کو اس کی باتوں کا علم ہو گیا تو کیا ہو گا یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹا جاتا تھا۔ میں نے ہمیشہ ایک استاد بن کر، ایک رہبر اور راہنما بن کر اس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا۔ اور وہ اس قسم کے خیالات پال لے گی، میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

پورچ کے قریب پہنچ کر ایک لحظہ کو رک کر میں نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کو دیکھا۔ قدر آور کھڑکی کے شیشے کے اس پار مجھے مومو صوفے پر بیٹھی واضح دکھائی دے رہی تھی، ڈرائنگ روم کی چھت سے لٹکتے فانوس کی زرد روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

وہ رو رہی تھی۔

اس کا دوپٹہ کندھے سے لڑھک کر نیچے گر چکا تھا۔ زرد روشنی میں اس کے دودھیا بازو زرد لگ رہے تھے۔ اتنی دور سے بھی مجھے اس کا قدرے جھکا ہوا، آنسوؤں سے تر چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس چہرے پر اتنا دکھ اور کرب تھا، میرا دل چاہا۔ میں رک جاؤں اور واپس جا کر اسے سمجھاؤں۔ اس روتی ہوئی چھوٹی سی لڑکی کو چپ کراؤں۔ اس کو پہلی بار میں نے اس بری طرح روتے دیکھا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں کسی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ اپنی عزت نفس اور انا کھونے کے بعد اس نے مجھے بھی کھو دیا تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ رہی تھی، اس کے آنسوؤں میں مجھے اس کی ٹوٹتی بکھرتی ذات کی کرچیاں نظر آ رہی تھیں۔ اسے میں نے بہت رلایا تھا، بہت دکھی کر دیا تھا، مگر اس نے مجھ سے میرے حوصلے سے زیادہ مانگ لیا تھا۔ اس نے ناممکن بات کر دی تھی۔

میں اس کو چپ کرانا چاہتا تھا، اس کے آنسو پونچھنا چاہتا تھا مگر...... میں نے رخ موڑ لیا، میں اسے روتا چھوڑ کر چلا آیا۔

اس رات میں سو نہیں سکا۔ تمام رات بے چینی و اضطراب سے بستر پر کروٹیں بدلتے گزری۔ مجھے صوفے پر بیٹھی بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ روتی ہوئی چھوٹی سی لڑکی یاد آ رہی تھی اور مجھے پتہ تھا وہ بھی پوری رات نہیں سوئی ہو گی۔ صرف مومو کو میرے دل کی بات نہیں پتہ چل جاتی تھی، مجھے بھی کبھی کبھی اس کے دل کا حال پتہ چل جاتا تھا۔

صبح اٹھ کر میں نے فیصلہ کر لیا۔ فرار کا فیصلہ، پتہ نہیں یہ کس سے فرار تھا؟ خود اپنے آپ سے یا مومو سے؟ میں نے اپنا بیگ تیار کیا، آفس سے چھٹی لی اور آفس کے ایک ملازم سلطان کو گھر کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر کراچی چلا آیا۔

میں کتنے دنوں کے لیے آیا تھا، مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ بس اتنا پتہ تھا کہ میں پیچھے کوئی بھی کونٹیکٹ نمبر چھوڑے بغیر بھاگ رہا تھا۔

کراچی سے میں ناردرن ایریاز چلا گیا، کتنے ہی ہفتے میں پہاڑوں اور چشموں کو چھانتا رہا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر اور دوسرے سے تیسرے، میں نے وہ تمام خوب صورت مقامات دیکھ لیے جو اپنی اپنی خوبصورتی کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اس وقت وہ بہت ہی غیر ترقی یافتہ تھے۔ سڑکیں خراب اور سہولیات ناپید تھیں، پھر بھی میں نگر نگر گھومتا رہا۔

چار ماہ گزر گئے، میں گھر واپس نہیں گیا، نہ ہی وہاں فون کر کے حالات پتا کیے۔

پھر پانچواں مہینہ شروع ہونے سے قبل میں تھک ہار کر واپس اسلام آباد چلا آیا۔

❋❋❋

واپس آیا تو گھر بہت اجڑا اجڑا سا لگا۔ سلطان صفائی کر تو دیتا تھا، مگر اوپر اوپر سے، دل سے نہیں۔ دل سے اور دل لگا کر تو میری چیزوں کا خیال صرف مومو رکھتی تھی۔

"سامان نکال لاؤ۔" گاڑی کی چابی سے ڈگی کھول کر سلطان کو ہدایت دیتے ہوئے میں اندر آ گیا۔

لونگ روم میں رکھے ان ڈور پلانٹس مرجھا سے گئے تھے۔

میں نے کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکا۔ میں بہت تھک چکا تھا، آخر کتنا بھاگ سکتا تھا مومو سے؟ بھاگنے سے بہتر تھا، میں اس کے پاس جاؤں اور اسے سمجھاؤں، یا پھر یوں ظاہر کروں، جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ یقیناً چند دنوں میں اپنی اس نادانی کو بھول جائے گی اور ہماری زندگی ویسی ہی ہو جائے گی، رویوں کی بے ساختگی تو واپس نہیں آ سکتی تھی، مگر بہر حال، میں یہ فیصلہ کر کے ہی لوٹا تھا۔

"بڑے دن لگا دیئے آپ نے صاحب!" سلطان میرا بڑا والا بیگ اٹھا کر اندر آ گیا۔

"کوئی آیا گیا؟" میں فریج کی جانب بڑھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔

"ہاں جی۔ وہ انہوں نے۔" اس نے جیسے دماغ پر زور دیا۔ "بھلا سا نام تھا، پتہ نہیں، یاد ہی نہیں رہا۔ مگر انہوں نے جی آپ کے جانے کے دو ماہ بعد تک روز شام صبح ادھر کے چکر لگائے تھے، پتہ نہیں جی کیا مسئلہ تھا۔ ان کے چہرے پر بڑی پریشانی تھی، میں نے انہیں ہر بار بتایا کہ صاحب کے آنے کا کچھ پتا نہیں ہے، پھر بھی وہ......"

"کوئی پیغام دیا تھا اس نے؟" میں نے اکتا کر اس کی بات کاٹی۔

"ہاں...... دو ماہ پہلے، جب انہوں نے آخری بار چکر لگایا تھا تو ایک کاغذ دیا تھا، لیکن ایک

زبانی پیغام بھی بہت بار دیا تھا کہ آپ کا فون آئے تو بتا دوں، مگر جی آپ کا فون ہی نہیں آیا، اس لیے......"

"کیا یہ پیغام دیا تھا؟" میں نے پانی کی بوتل لبوں سے ہٹاتے ہوئے قدرے بے چینی سے استفسار کیا۔ پتہ نہیں مومو نے میرے لئے کیا پیغام چھوڑا تھا۔

"وہ جی انہوں نے کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں۔ میں نے بابر صاحب کو اپنی بیٹی کی وجہ سے انکار کر دیا ہے۔ اتنی بار انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے یاد رہ ہی گیا۔"

میرے ہاتھ سے پانی کی بوتل چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

"کون؟ حیدر...... حیدر آیا تھا؟ صبح شام ادھر حیدر آتا رہا تھا؟" میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے سلطان کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں جی...... یہی نام تھا ان کا۔"

میرے قدموں سے آہستہ آہستہ زمین سرک رہی تھی۔

"کوئی...... کوئی لڑکی نہیں آئی؟"

"نہ جی لڑکی تو کوئی نہیں آئی۔ وہی حیدر صاحب آئے تھے، ایک خط دے گئے تھے، پھر اس کے بعد نہیں آئے۔"

دو منٹ بعد وہ خط لے آیا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ خط کھولا۔ وہ حیدر کی ہینڈ رائٹنگ تھی۔

"حسان! دو ماہ پہلے مومو میرے پاس آئی تھی، جس روز میں نے تمہیں بابر سے ملوایا تھا، اس رات وہ میرے پاس آئی تھی اور جانتے ہو، وہ رو رہی تھی، حسان! میری بیٹی رو رہی تھی، میری مہرالنساء رو رہی تھی۔

جانتے ہو اس نے مجھ سے کیا کہا؟ اس نے کہا۔" آپ تانیہ آنٹی کو انکار کر دیں، میں نے ہمیشہ خود کو سر کے ساتھ دیکھا ہے، مجھے سر سے الگ مت کریں۔" اور اس نے یہ بھی کہا۔" آپ بہت برے ہیں پاپا، آپ اپنی مومو سے اس کی سب سے قیمتی شے چھین رہے ہیں۔"

وہ رو رہی تھی حسان! اس نے روتے بلکتے زندگی میں پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا تھا۔ میں اپنی مومو کو کیسے انکار کر سکتا ہوں؟ میں اسے انکار ہی نہیں کر سکا، مجھے میری مومو بہت پیاری ہے۔

وہ کہتی ہے سر کہتے ہیں میں پاگل ہوں۔

حسان! میری بیٹی پاگل نہیں ہے۔ تمہارے معاملے میں وہ ہمیشہ سے ایسی ہے۔ جب اس نے 8th کلاس میں پوزیشن لی تھی تو میں نے اسی روز اسے گولڈ کے ٹاپس دیئے تھے۔ وہ خوش ہوئی تھی، مگر اس نے وہ ٹاپس کبھی نہیں پہنے۔ پھر دوپہر میں تم آئے اور تم نے اسے گھڑی دی، وہ اتنی خوش ہوئی، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس نے اپنی پوری کلاس میں اپنا شاندار رزلٹ کارڈ نہیں، بلکہ وہ گھڑی دکھائی، اور وہ گلاب کے پھول جو تم نے اسے دیئے تھے، وہ آج بھی اس کی کتابوں میں محفوظ پڑے ہیں اور تم کہتے ہو، میری مومو پاگل ہے؟

وہ کہتی ہے سر کہتے ہیں، تمہیں حیدر پیار نہیں کرتا۔

حسان! میں تو اسے ہمیشہ سے پیار کرتا ہوں۔ تم کتنا جانتے ہو، میرے اور مومو کے ریلیشن کے بارے میں۔ تم روز صرف ایک گھنٹہ ہمارے گھر آتے ہو، صرف ایک گھنٹہ۔ اسی لئے تمہیں علم نہیں ہے کہ میں اور مومو روز رات بارہ ایک بجے تک بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ اس کو گڈ نائٹ کہہ کر میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ مومو جانتی تھی، تم یہ سمجھتے ہو۔ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خوف تھا کہ تم اس کو محبت اور توجہ بھی اسی لیے دیتے ہو، اسی لیے اس نے کبھی تمہاری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مومو اندر سے بہت بزدل لڑکی ہے، وہ بہت سے لوگوں کو بہت ساری باتیں اس ڈر سے نہیں بتاتی کہ کہیں وہ اس سے محبت کرنا چھوڑ دیں، ورنہ میں نے تو سونیا سے بھی زیادہ محبت مومو سے کی ہے اور جانتے ہو، اس رات وہ رو رہی تھی۔ میری سونیا، میری مہرالنساء رو رہی تھی۔

میں باپ ہوں، میری مجبوری کو سمجھو میں نے اسے سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کو اس کے سر سے الگ نہیں کروں گا۔ میں روز تمہارے گھر کے چکر لگاتا ہوں، مگر تم بھاگ رہے ہو۔ تم مومو اور حیدر سے بھاگ رہے ہو۔ اگر تم نے فرار ختم نہ کیا تو مومو کچھ بہت غلط کر ڈالے گی اور میں اسے روک بھی نہیں سکوں گا۔

واپس آجاؤ حسان میں مومو کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

میں نے اس خط کو اتنی دفعہ پڑھا کہ اس کے الفاظ میرے ذہن پر حیدر نقش ہو کر رہ گئے۔ مجھے لگا مومو میرے سامنے صوفے پر بیٹھی ہے۔ اس کی کہنیاں اس کی گود میں رکھے کشن پر ہیں۔

اس کے آرٹسٹک ہاتھوں کی خوب صورت انگلیاں اس کی بالوں میں پھنسی ہیں۔ اس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر فانوس کی زرد روشنی پڑ رہی ہے اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔

میں ایک دم بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اگر حیدر اسے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا تو حسان بھی اسے روتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے زندگی میں سب سے زیادہ محبت مومو سے کی تھی، مگر میں اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے نزدیک یہ ایک غیر فطری بات تھی۔

’میں اسے منالوں گا، میں حیدر کو بھی سمجھالوں گا‘ یہی سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا، مجھے لگا، شاید وہ ابھی تک اپنے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھی رو رہی ہو۔

اسی وقت گاڑی تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے، بہت سی امیدیں اور خدشات لے کر میں مومو کے گھر گیا تھا۔ اس کے گیٹ کے باہر ایک جھٹکے سے میں نے گاڑی روکی اور باہر نکل کر بے یقینی سے گیٹ پر لگے تالے کو دیکھا۔

وہاں تالا کیوں لگا تھا؟

میں نے بے اختیار بیل بجائی اور پھر بجاتا چلا گیا، مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ زمین اور آسمان میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے، حیدر، مومو، آنٹی سب کدھر چلے گئے تھے؟

جب گھنٹی پر کسی نے دروازہ نہ کھولا تو مین نے گیٹ کو ہاتھوں سے بجانا شروع کر دیا۔

’’مومو...... مومو!‘‘ میں اسے آوازیں دے رہا تھا، مگر وہ نہ آئی۔ گیٹ پیٹنے کی آواز سن کر ساتھ والے گھر سے مسز ہاشمی کی بڑی بہو نکل آئیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ سا ہوا۔

’’حیدر اور اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ علم ہے آپ کو؟ میں کافی عرصے بعد آیا ہوں، یہ سب کدھر چلے گئے ہیں؟‘‘

’’حیدر صاحب کی تو ڈیتھ ہوگئی ہے۔‘‘

میں کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹا تھا، کسی نے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

’’کک...... کیا کہا آپ نے؟ حیدر کی ڈیتھ؟‘‘ مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ یقیناً کوئی بھیانک خواب تھا، بھلا حیدر کیسے مر سکتا تھا؟

’’دو مہینے پہلے انہیں دل کی تکلیف ہوئی تھی، ایمبولینس انہیں ہسپتال لے کر جارہی تھی کہ راستے میں ایکسیڈنٹ ہوگیا، وہ موقع پر ہی ایکسپائر ہوگئے تھے۔‘‘ وہ تاسف سے بتا رہی تھیں۔

میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا دوست، میرا کزن، میرا حیدر جو مجھ سے اپنی بیٹی کی خوشیاں مانگنے ہر روز میرے گھر آتا تھا، جو کہتا تھا میں مومو کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، وہ حیدر اب نہیں رہا تھا، وہ مر گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اور ان کی بیٹی اور والدہ؟'' کتنی ہی دیر بعد میں بولا تو مجھے اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی سنائی دی تھی۔

''وہ تو چلے گئے۔''

''چلے گئے؟ کدھر چلے گئے؟'' مجھے لگ رہا تھا، میں پاگل ہو جاؤں گا۔

''ان کی والدہ کی کوئی بھانجی آئی تھیں۔ کینیڈا سے، وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر کینیڈا چلی گئیں۔ ابھی کل ہی گئے ہیں وہ لوگ......''

''وہ واپس...... واپس کب آئیں گے؟'' کسی امید کے تحت میرے لبوں سے نکلا تھا۔

''واپس تو نہیں آئیں گے، وہ تو ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں۔''

میں تھکے تھکے قدموں سے اپنی گاڑی کی جانب پلٹ آیا۔ میرا دماغ درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ، میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے...... سب کچھ جیسے خواب کی سی کیفیت میں ہو رہا تھا۔

میرے پیچھے اتنا کچھ ہو گیا اور میں بے خبر رہا، میں اتنا سنگدل تو نہیں تھا اور مومو وہ چلی گئی؟ وہ کیوں چلی گئی؟ میں کیسے رہوں گا مومو کے بغیر؟

محبت تو میں نے اس سے بہت کی تھی، مگر میں احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ اپنی بڑھتی عمر کے احساس کمتری میں میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ ہم پر ہنسیں، ہمارا مذاق اڑائیں، میں ڈرتا تھا، میں بزدل تھا، مومو کو میں نے اس وقت کہا تھا کہ'' میں تو ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا، مگر میں نے ایسا تصور کیا تھا، میرے دل میں بھی چور تھا۔ اگر چور نہ ہوتا تو میں بھاگتا کیوں؟''

اور حیدر...... اس نے جان دے دی؟ اسے دل کی تکلیف کب سے شروع ہوئی تھی؟ اس رات سے جب اس نے اپنی بیٹی کو روتے دیکھا تھا یا پھر اس روز سے جب وہ میری جانب سے مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا؟

مومو ٹھیک تھی، میں غلط تھا، وہ صحیح کہتی تھی کہ میں اس سے ویسی ہی محبت کرتا تھا، جیسی وہ مجھ سے کرتی تھی، مگر میں عدم تحفظ کا شکار تھا، بزدل اور خودغرض اور سب لوگوں کی طرح۔

اور مومو، جو اپنی تمام تر بزدلی کے باوجود مجھ سے زیادہ بہادر تھی۔ زندگی میں پہلی دفعہ مجھ سے ناراض ہو کر بہت دور جا چکی تھی۔

* * *

مومو گئی تو اپنے ساتھ زندگی کی رنگینیاں، روشنیاں اور تتلیاں بھی لے گئی۔ میری ذات، میرا وجود؟ میری زندگی، سب کچھ بہت بے کیف اور بے رونق سا ہو کر رہ گیا تھا۔

روز شام چھ بجے میں اپنی گاڑی عادتاً مومو کے گیٹ کے سامنے لے جا کر ہارن بجاتا، پھر اچانک مجھے یاد آتا کہ اب اندر سے کوئی چھوٹی سی لڑکی نکل کر یہ نہیں کہے گی کہ'' سر! آج میرا ٹیسٹ ہے یا جلدی آئیں سر! میں نے آپ کے لیے چکن شاشلک بنایا ہے، دیر کریں گے تو ٹھنڈا ہو جائے گا اور پھر آپ نہیں کھائیں گے۔'' کیونکہ وہ لڑکی تو جا چکی تھی۔

میں بوجھل دل لیے واپس آ جاتا، مگر اگلی شام پھر اس کے گھر چلا جاتا۔ پھر یہ بھول ہر شام ہونے لگی۔ ساڑھے پندرہ برس کی عادتیں اتنی آسانی سے تو نہیں جاتیں۔

جیسے ہر بندہ اپنے گھر واپس لوٹتا ہے، اسی طرح ہر شام میں اس کے گھر جاتا تھا۔ کتنے ہی مہینے بیت گئے اور مجھے یقین آ گیا کہ وہ مڑی ہوئی پلکوں والی لڑکی وہاں سے جا چکی ہے۔ جب یہ یقین آ گیا تو میں وہ بھول جان بوجھ کر دہرانے لگا۔

دو برس تک یہ سلسلہ چلتا رہا میں نے امیدیں لے کر اس کے گھر کے دروازے پر جانا چھوڑ دیا۔ میں نے گھر میں ناشتہ کرنا بھی چھوڑ دیا، کیونکہ وہ مجھے مومو کی یاد دلاتا تھا۔

میں نے رات کا کھانا کھانا بھی چھوڑ دیا، کیونکہ وہ مجھے صرف مومو کے ہاتھ کا پسند تھا، میں نے لونگ روم میں ان ڈور پلانٹس رکھنے بھی چھوڑ دیے۔ میں نے بہت کچھ چھوڑ دیا۔ بس اس بھوری آنکھوں والی نازک سی لڑکی سے محبت کرنا نہ چھوڑ سکا۔ یہ میرے اختیار میں نہ تھا۔

پھر میں نے اپنی بے رونق، پھیکی زندگی میں رنگ بھرنا چاہا۔ وہ رنگ جو مومو کو پسند تھے، جن کو وہ اپنی خوب صورت انگلیوں سے کینوس سے بکھیرنا چاہتی تھی، ہاں وہی رنگ میں نے اپنی زندگی میں بھرنا چاہا۔

پینٹنگ میرا بچپن کا شوق تھا۔ جب میں اسکول میں تھا تو جاپانی ایمبیسی کے زیر انعقاد ایک پینٹنگ کمپیٹیشن میں میری بنائی گئی ایک تصویر کو پہلا انعام اور مجھے بطور اعزاز آٹھ سو ڈالرز دیے

گئے تھے۔ وہ ڈالرز میری ٹیچر نے خود رکھ لیے تھے اور وہ پینٹنگ مجھے کبھی واپس نہیں ملی۔ کیونکہ وہ میری پرنسپل کی بیٹی کو بہت پسند آ گئی تھی۔ سو پرنسپل صاحبہ نے وہ اسے گفٹ کر دی۔

کوئی انسان یونہی دنیا سے بے اعتبار، بدگمان اور شکی مزاج نہیں بن جاتا۔ یہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں، جو ہم پر بہت گہرا نفسیاتی اثر چھوڑتی ہیں۔

میں اس واقعے سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اپنا برش توڑ دیا، ایزل اور کینوس جلا ڈالے اور رنگ پھینک دیئے۔ یوں میں نے وقتی طور پر اپنے اندر کے آرٹسٹ کو مار ڈالا۔

مگر رنگوں اور تتلیوں کا دیس مجھے واپس اپنی جانب بلاتا رہتا تھا۔

اور پھر جب اس روز جب میں نے مومو کی مصوری دیکھی تو مجھے ایک انجانا سا سکون ملا تھا۔

اسی لیے تو میں اسے پینٹر بننے کے لیے کہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے اندر کے آرٹسٹ کو باہر نکال ہی لائے گی، وہ کینیڈا جا کر آرٹ ہی پڑھے گی۔ مومو کی انگلیاں یہ بات کہتی تھیں اور میرا دل یہ بات کہتا تھا۔

مومو کے جانے کے تیسرے برس میں نے ایک آرٹ اکیڈمی شام چھ سے سات جوائن کر لی۔ جو وقت میں پہلے مومو کو دیتا تھا، اب مومو کے رنگوں کو دے رہا تھا۔

کبھی کبھار کینوس پر رنگ بکھیرتے ہوئے میں اپنے برش کو انگلیوں کے درمیان تھام کر سوچتا تھا کہ شاید مومو بھی اس کمپنی اور ساخت کا برش استعمال کرتی ہو، شاید وہ بھی رنگ کرتے وقت گردن کو یونہی ترچھا کرتی ہو، شاید اس کے ہاتھوں پر بھی میری طرح Pastal کلرز لگ جاتے ہوں، مگر اس کے ہاتھ تو بے حد خوب صورت تھے اور میرے ہاتھ، میری شکل وصورت کی طرح عام سے ہی تھے۔

دو سالوں تک مختلف اکیڈمیوں میں آرٹ پڑھنے اور سیکھنے کے بعد میں نے ملٹی نیشنل فرم کی وہ جاب چھوڑ دی، جس کی خواہش لاکھوں نوجوان کرتے تھے، مگر مجھے کوئی خواہش نہیں تھی یا پھر اب رہی نہیں تھی۔

جاب چھوڑنے کے بعد میں نے اپنے بینک بیلنس اور کچھ سیونگز کو ملا کر ایک جگہ کمرہ حاصل کر کے اپنی آرٹ اکیڈمی کھول لی۔

میری پینٹنگز اور میری اکیڈمی اب میرے اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی تھیں، میں

خوش نہیں تھا، مگر مطمئن اور پرسکون ضرور تھا۔

میری آرٹ اکیڈمی کے دوسرے بیچ میں ایک بارہ سالہ لڑکی بھی سیکھنے آئی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے پتہ نہیں کیوں مومو یاد آ جاتی تھی۔ اس کا نام ماریہ تھا، اس کے ہاتھ اور انگلیوں کی ساخت بالکل مومو جیسی تھی اور اس کی بھوری آنکھیں، مڑی ہوئی پلکیں اور لمبی سی فرنچ بریڈ بالکل مومو کی طرح تھیں۔ چہرے کے نقوش، رنگت، قد، وہ ہر لحاظ سے مومو سے مختلف تھی، مگر پھر بھی دونوں میں بہت مماثلت تھی۔

ماریہ باتیں بھی مومو کی طرح کرتی تھی۔ دوسروں کی ہمدردی میں پگھل جانا، کسی کے غم کو اپنا سمجھ لینا اور خود کو فوراً قربانی کے لیے پیش کر دینا۔ وہ مومو سے بہت ملتی تھی۔

جب اس نے اسکیچ بنانا سیکھا تو پہلا اسکیچ ایک پولیٹیکل لیڈر کا بنایا، اس کا وہ اسکیچ ہاتھ میں پکڑے مجھے مومو بری طرح یاد آئی تھی۔

وہ بھی تو ایسی ہی تھی، لیڈرز اور سیاست دانوں کو پسند کرنے والی اور ایسی لڑکیوں کو میں بے وقوف کہا کرتا تھا۔ جانے وہ کیوں اسکیچ دیکھتے ہی میرے لبوں سے مومو نکلا تھا۔

”جی سر!“ ماریہ، جو میرے سامنے کھڑی تھی، قدرے حیرت بھری تابعداری سے بولی۔

میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر دھیرے سے مسکرایا۔

”کچھ نہیں۔“

”سر! آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میرا نک نیم مومو ہے؟“ اس نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا، مگر پھر میں سنبھل کر مسکرا دیا۔ ”تمہاری شکل پر لکھا ہے ماریہ؟“

”میری شکل پر؟“ وہ میری بات پر حیران ہوتی ہوئی اپنی جگہ پر بیٹھی۔

اس روز کلاس کے بعد جب میں اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا، ماریہ میرے پاس چلی آئی۔

”سر ایک بات مانیں گے؟“

”ہاں بولو بیٹا!“ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

اس نے بلو جینز کے اوپر آدھے بازوؤں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی، بال ہمیشہ کی طرح فرنچ چوٹی میں مقید تھے، یہ حلیہ تو کسی اور کا بھی ہوتا تھا، میں یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”سر آپ میرا پورٹریٹ بنائیں گے؟“

"شیور، کیوں نہیں۔" اس کے ہچکچاتے انداز پر میں مسکرایا۔ "کل اکیڈمی ٹائم کے بعد ایک گھنٹہ ایکسٹرا بیٹھ جانا۔"

"کتنی سٹنگز ہوں گی سر؟" وہ مجھے بالکل مومو کی طرح سر کہتے ہوئے R کو Silent کرتی تھی۔

"دو یا تین، مگر میں گارنٹی نہیں دیتا کہ وہ بہت اچھی ہو گی۔"

"ارے نہیں سر! آپ تو بہت اچھی پینٹنگز بناتے ہیں۔" وہ ہنس کر بولی۔ اس طرح مجھے ارے نہیں سر کون کہا کرتا تھا، میں یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اگلی شام، اس کو اسٹول پر اپنے سامنے بٹھا کر میں نے جب اس کا پورٹریٹ بنانا شروع کیا تو آغاز آنکھوں سے کیا، اس کی آنکھیں بناتے بناتے میرے ذہن کے پردوں پر وہ منظر لہرایا، جب مومو میرے سامنے ٹانگ پر ٹانگ رکھے، نائمہ کے لاؤنج میں آرام سے بیٹھی تھی اور اٹھنے کے موڈ میں نہ تھی۔

ایک سٹنگ میں پورٹریٹ مکمل کرنے کے بعد میں یہ جانتے ہوئے بھی پرسکون تھا کہ میں نے ماریہ کا نہیں، مومو کا پورٹریٹ بنا دیا تھا۔

"بن گئی سر؟" ایک گھنٹے سے اسٹول پر ماڈل بن کر بیٹھی ماریہ چل کر میرے پاس آئی۔ میری تصویر پر نگاہ پڑتے ہی اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

"کیسی بنی ہے؟"

"بہت اچھی ہے، سر! مگر اس میں، میں کہاں ہوں؟" اس کے انداز پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"تمہاری کل بنا دوں گا، یہ کسی اور کی ہے۔"

"کس کی ہے؟" اپنی مایوسی بھلائے وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔ میں نے برش کے کنارے کو لبوں تلے دبائے کچھ دیر کو سوچا۔

"مومو کی ہے۔"

"مومو کون؟" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"ہے ایک لڑکی۔" میں اداس سا ہو گیا۔ "مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

"کدھر؟" وہ بھی اداسی سے پوچھنے لگی۔

"کینیڈا۔"

"کیوں سر؟" وہ میرے پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"میں نے اسے ناراض کر دیا تھا۔" میں سر جھکائے بتانے لگا۔

"تو آپ منا لیں نا۔"

میں نے سر اٹھا کر مغموم انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ "مجھے اس کو منانا نہیں آتا۔"

"کیوں سر؟"

"میں نے اسے کبھی منایا ہی نہیں۔"

"تو اب منا لیں نا۔"

"کیسے؟" میں نے ابرو اٹھائے۔

"کہہ دیں آئی ایم سوری۔ سو سمپل!" اس نے آرام سے کہہ دیا۔

"ہر بات آئی ایم سوری سے حل نہیں ہو جایا کرتی ماریہ!"

"سر! مجھے پوری کلاس مومو کہتی ہے آپ ماریہ کیوں کہتے ہیں؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"میری صرف ایک ہی مومو تھی۔ بہت اچھی فرینڈ تھی، وہ میری۔ تمہاری کوئی فرینڈ ہے ماریہ؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

اس نے افسردگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میری کوئی فرینڈ بنتی ہی نہیں ہے۔"

"ارے وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے اٹھ کر چلی گئی۔

مومو بھی ایسے ہی اٹھ کر چلی جاتی تھی۔ میں کبھی مومو کے پیچھے نہیں گیا تو ماریہ کے پیچھے کیسے جاتا؟

اگلی شام مجھے ماریہ بہت چپ چپ لگی تھی۔ چھٹی کے وقت جب سب بچے جانے لگے تو میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔

"ادھر آؤ۔"

وہ جو اپنا پنک کلر کا بیگ لے کر باہر کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی، میری بات پر سر جھکائے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو ادھر!" وہ بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔

"ماریہ! تمہاری ممی کب فوت ہوئی تھیں؟" اس کے آنے سے پہلے میں نے فاطمہ سے، جو ماریہ کے گھر کے قریب رہتی تھی، اس کے متعلق پوچھا تھا۔

وہ چند لمحے میری جانب خاموشی سے دیکھتی رہی، پھر بولی۔

"جب میں دو سال کی تھی تب!"

"اور تمہارے فادر؟ وہ تمہارا خیال کرتے ہیں؟" مجھے پتا نہیں کیوں حیدر یاد آیا تھا۔

"وہ مجھ سے زیادہ سارہ مما میں انٹرسٹڈ ہیں، سارہ مما میری خالہ ہیں، وہ کئی سالوں سے میرے بہانے پاپا سے ملنے ہمارے گھر آتی رہتی ہیں۔ وہ پاپا سے شادی کرنا چاہتی ہیں اور انہیں لگتا ہے کہ میں چھوٹی بچی ہوں اور کچھ نہیں سمجھتی۔" چھوٹی عمر میں بڑے بڑے غم مہر النساء اور ماریہ کو بہت جلدی سنجیدہ اور میچور کر دیتے ہیں۔

"اور پاپا ان سے شادی کر لیں گے؟"

"جی۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔

"تمہیں اچھی نہیں لگتیں سارہ مما؟" میں اس کے چہرے کو پڑھ رہا تھا۔

"بالکل بھی نہیں۔ وہ مجھے گھر سے نکال دیں گی۔"

"ارے نہیں ماریہ! گھر سے کیوں نکال دیں گی؟ تمہارے پاپا کا گھر ہے اور بھلا گھر سے کدھر نکالیں گی؟" اس نے یقیناً سنڈریلا ٹائپ کی بہت ساری کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔

"آپ کو نہیں پتہ، ہے ایک جگہ۔" وہ بڑبڑائی تھی۔

گاڑی کے ہارن کی آواز آئی تو ماریہ اپنا بیگ سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر چند ہفتوں بعد ماریہ نے مجھے بتایا۔ "سر! پاپا نے سارہ مما سے شادی کر لی ہے۔" وہ ان دنوں بہت ڈری سہمی سی رہنے لگی تھی۔ میں نے اسے امید دلائی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا، تب اس نے مجھ سے ایک فرمائش کی۔

"سر آپ میرے گھر آئیں۔"

اور میں نے ہامی بھر لی۔ "ہاں ماریہ! میں آؤں گا تمہارے گھر اور تمہارے پاپا سے بات کروں گا کہ وہ سارہ مما سے زیادہ تمہیں امپورٹنس دیا کریں۔"

وہ خوش ہو گئی۔

ہامی تو میں نے بھر لی، مگر پھر ان دنوں کسی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے مجھے کراچی جانا پڑ گیا۔

میں نے چار روز اکیڈمی کی چھٹی کر دی۔ چار بے حد مصروف دن گزارنے کے بعد، جب میں اکیڈمی آیا تو میری پوری کلاس موجود تھی، ماسوائے اس کھڑکی کے ساتھ والی کرسی کے، وہ کرسی خالی تھی۔

یہ ماریہ کی پورے سال کی پہلی چھٹی تھی، اس لیے میں نظرانداز کر گیا، لیکن جب وہ اگلا پورا ہفتہ نہ آئی تو مجھے فکر ہوئی۔

"یہ ماریہ کیوں نہیں آ رہی؟" میں نے قدرے بلند آواز میں کسی کو مخاطب کیے بغیر کلاس سے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں سر!"

"پتا نہیں سر!" کی صدائیں بلند ہوئیں۔

"سر آئی تھینک! اس کی اسٹیپ مدر نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔" فاطمہ، ماریہ کے گھر کے ساتھ رہتی تھی، اسی لیے اس کے حالات سے اس حد تک واقف تھی۔

"گھر سے کدھر نکال دیا ہے؟ اسٹیپ مدر ہی ہے، کوئی جادوگرنی تو نہیں جو گھر سے باہر نکالے۔" میں نے قدرے بےزاری سے کہا۔

"سر! ہو سکتا ہے، آنٹی نے اسے ہسپتال بھیج دیا ہو۔" فاطمہ دوبارہ بولی۔

"ہسپتال؟ کیوں؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ کو پتہ نہیں سر؟" بہت سے اسٹوڈنٹس اکٹھے بولے تھے۔

"کیا نہیں پتہ؟" میں یکدم پریشان سا ہو گیا۔

"سر! ماریہ کو تھائی رائیڈ گلینڈ کا کینسر ہے۔"

"واٹ؟" میں بے حد شاکڈ ہو کر فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔

ماریہ کہتی تھی، اسے کوئی دوست نہیں بناتا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بیمار تھی۔ زندگی سے لڑ رہی تھی، کینسر کوئی چھوت کا مرض نہیں تھا، مگر یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ بیمار اور معذور انسانوں کو تنہا کر دیا جاتا ہے۔ وہ چھوٹی سی لڑکی جو مجھے مومو کی یاد دلاتی تھی، وہ بھی اسی المیے کا شکار تھی۔

"کب ہوا اسے کینسر؟" میں فکرمندی سے پوچھنے لگا۔

"کافی عرصے سے ہے۔ اب تو آخری اسٹیج ہے، چند ماہ پہلے ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ اس کے پاس چھ ماہ سے ایک برس تک کا وقت ہے۔" فاطمہ کے لہجے میں تاسف تھا۔

میں سر ہلا کر بے دھیانی سے اسٹوڈنٹس کی اسائمنٹس دیکھنے لگا۔ دل میں مجھے بار بار ماریہ کا خیال آ رہا تھا۔

پتہ نہیں وہ کدھر ہوگی، کس حال میں ہوگی۔ اگر اس کی سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال کر ہسپتال بھیج دیا ہو تو، وہاں اس کے ساتھ کوئی ہوگا؟ یا وہ تنہا کمرے میں اپنی زندگی کے آخری دن کاٹ رہی ہوگی۔ پتہ نہیں اس کے پاس اس کے برش کلرز اور کینوس بھی ہوں گے یا نہیں اور اس کا وہ پنک کلر کا بیگ جو وہ ہمیشہ اپنے پاس اٹھائے رکھتی تھی، پتہ نہیں وہ بیگ اس کی سوتیلی ماں نے اسے ساتھ لے جانے دیا ہوگا یا نہیں۔

بہت سے سوال تھے، جن کے جوابات میرے پاس نہیں تھے۔ میرا دل اردگرد سے سخت اچاٹ ہو چکا تھا۔ میں نے بچوں کی جلدی چھٹی کر دی اور خود اپنے داخلہ رجسٹر سے ماریہ کے والد کی ID کارڈ کی فوٹو کاپی سے اس کا ایڈریس لے کر اس کے گھر چلا گیا۔

اس کی بے حد خوبصورت، مگر سرد مہر سوتیلی ماں نے انتہائی کھردرے اور روکھے انداز میں مجھے اتنا ہی بتایا۔

"کل صبح آپریشن ہے، مومو کا۔ سی ایم ایچ میں ایڈمٹ ہے۔"

میں نے کمرہ نمبر پوچھ کر استفسار کیا۔ "اس کے پاس کوئی ہے، یا وہ اکیلی ہے؟"

"حسان صاحب! ہم یہاں فارغ نہیں بیٹھے کہ مومو کی پائنتی سے لگ کر اس کا دل بہلائیں۔ سو کام ہوتے ہیں، فرصت کسے ہے یہاں؟ جب ٹائم ملتا ہے تو چلے جاتے ہیں۔" انداز میں لاتعلقی اور بے نیازی تھی۔ وہ واقعی سنو وائٹ والی سوتیلی ماں تھی۔

میں ماریہ سے ملنے اسلام آباد سے پنڈی سی ایم ایچ چلا گیا۔ سارہ نے جان بوجھ کر اسے

پنڈی میں داخل کروایا تھا تاکہ اس کا باپ اس سے ملنے روز روز نہ جا سکے۔

میں نے تازہ سرخ گلابوں کا ایک بوکے خریدا اور ہسپتال آ گیا۔ ایسا ہی ایک بوکے میں نے مومو کو بھی دیا تھا اور حیدر کہتا تھا، مومو نے وہ...... پھول کتابوں میں سکھا کر رکھے ہوئے تھے۔

مومو کو ذہن سے جھٹک کر میں ماریہ کے وارڈ کی طرف چلا گیا۔

دروازہ ہلکا سا بجا کر میں اندر داخل ہوا۔ وہ ایک درمیانے سائز کا وارڈ تھا، درمیان میں پردوں سے پارٹیشن کیا ہوا تھا، ایک طرف ماریہ کا بیڈ تھا، دوسری جانب کا بیڈ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"مومو۔"

ماریہ بیڈ پر تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر لیٹی ہوئی تھی، وہ چھت کو دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے نگاہیں گھما کر میری جانب دیکھا۔ ایک دم اس کی بھوری آنکھوں میں حیرت نما خوشی ابھری تھی۔

"سر آپ ادھر؟" اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی، میں نے اشارے سے روکا۔

"یہ جو اس چھوٹی سی گڑیا نے بغیر بتائے اتنی ڈھیر ساری چھٹیاں کی ہیں نا۔ اس کے لیے اب اس کے سر ڈانٹنے آئے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہہ کر پھولوں کا گلدستہ اس کے ہاتھ میں دیا۔

"تھینک یو سر!" اس نے انہیں سونگھا۔ وہ بہت خوش اور فریش نظر آنے لگی تھی۔ ورنہ جس پل میں داخل ہوا تھا، وہ مجھے بہت پژمردہ لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے تھے، چہرہ سوکھ چکا تھا، گال اندر کو چلے گئے تھے اور رنگت یرقان کے مریضوں کی طرح زرد تھی۔

"مجھے ریڈ روز بہت اچھے لگتے ہیں سر! کیونکہ ان کا میسج بہت اچھا ہوتا ہے۔ ہے نا سر؟" وہ سر اٹھا کر میری جانب دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

میرے ذہن کی رو کہیں دور بھٹک گئی، ایسی ہی بات مومو نے بھی کی تھی، میں نے سر جھٹکا۔

"کیسی ہو، مومو؟" میں اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہوں سر! کل میرا آپریشن ہے۔" وہ اداس ہو گئی۔

"اداس مت ہوا کرو مومو! تم مجھے بہت عزیز ہو۔" میں نے اس کا چھوٹا سا ہاتھ اپنے دونوں

ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے دبایا۔

"سر! سارہ مما نے مجھے شروع سے بتا رکھا تھا کہ مجھے کینسر ہے۔ آپ کو پتہ ہے، ڈاکٹرز بچوں کو یہ بات نہیں بتاتے۔" وہ معصومیت بھرے انداز میں سارہ مما کی شکایت لگا رہی تھی۔

"پتہ ہے کیوں؟"

میں نے بھی اسی معصومیت سے نفی میں گردن ہلا دی۔

"کیونکہ جب بچوں کو پتہ چل جاتا ہے نا تو وہ خوف زدہ ہو کر بہت جلدی مر جاتے ہیں۔"

"ماریہ!" میں ایک دم تڑپ اٹھا تھا۔ ہسپتال میں رہ کر وہ پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی تھی۔

"کل تمہارا آپریشن ہے، جس کے بعد تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی، پھر ہم خوب ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔" کچھ دیر بعد اسے تسلی دے کر میں اٹھنے لگا تھا۔

اس نے مایوسی سے مجھے دیکھا۔ "آپ جا رہے ہیں، سر؟"

"ہاں، میں کل آؤں گا ماریہ۔" مجھے ہسپتال سے وحشت ہو رہی تھی۔ میں جلد از جلد وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ جتنا وقت میں ماریہ کے ہمراہ گزارتا، مجھے مومو یاد آتی رہتی۔

"آپ نہ جائیں سر!"

"او کے نہیں جاتا!" پتہ نہیں کیوں میں دوبارہ بیٹھ گیا۔

"کل میرا آپریشن ہے۔ کیا میں زندہ رہوں گی، سر؟" وہ ڈری سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔

میں اس کے سرہانے آ کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ اس کے شانوں کے گرد رکھے۔ "بس بیٹا، ایک چھوٹا سا، معمولی سا آپریشن ہے۔ میرے ایک بھانجے کے ایسے چھ آپریشن ہوئے تھے اور اب وہ چنگا بھلا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی، حالانکہ میری تو کوئی بہن ہی نہیں تھی۔

اس کی بھوری آنکھوں میں امید کی کرن جاگی۔

"یہ بس چھوٹا سا آپریشن ہے، اس کے بعد تمہیں اس اسپتال اور ان کڑوی دواؤں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی، تم بالکل ٹھیک ہو کر گھر چلی جاؤ گی۔"

اس کے سرہانے بیٹھا، میں اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

"کب ہے آپریشن؟" پھر میں نے پوچھا۔

"صبح چھ بجے۔" اس کا خوف اب کم ہو رہا تھا۔

"بس اب تھوڑا سا ٹائم رہ گیا ہے۔" میں نے رات کے ساڑھے نو بجاتی سوئی کو دیکھا۔

"سر!" تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے پکارا۔ "میں پینٹ کرنا چاہتی ہوں۔"

"ٹھہرو میں، تمہیں کاغذ اور پین لا دیتا ہوں۔" میں اٹھنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں بس مجھے میرا بیگ اٹھا دیں۔" اس نے اپنے پنک بیگ کی جانب اشارہ کیا، جو میز پر پڑا تھا۔ صد شکر اس کا وہ بیگ اس کے پاس تھا۔

میں نے بیگ اٹھا کر اسے دے دیا۔

اس نے آہستہ سے زپ کھولی، پھر آہستہ آہستہ اندر سے برش، واٹر پینٹس باہر نکالنے لگی۔ ایک کاغذ کو کلپ بورڈ میں لگا کر اس نے پنسل تھام لی۔

"مومو! کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم آرام کرو؟ کل تمہارا آپریشن ہے۔"

میں نے کسی خدشے کے پیش نظر کہا تھا۔

"پلیز سر!" اس نے اتنی ملتجی نگاہوں سے میری طرف دیکھا، یہ زندگی اور موت کی جنگ لڑتی، اس لڑکی کی بے بس آنکھیں تھیں۔ میرا دل بھر آیا۔

"اچھا بنا لو، مگر کیا بناؤ گی؟" اس نے پنسل کا سرا لبوں میں پکڑ کر ایک لمحے کو سوچا، پھر مسکرائی۔ "مومو!"

"اپنی شکل بناؤ گی؟"

"ارے نہیں سر!" وہ دھیرے سے ہنسی، اس کی سوکھی، زرد چہرے کی ہڈیاں ہنستے ہوئے نمایاں ہو جاتی تھیں۔

"میں نہیں آپ کی مومو۔"

"میری مومو؟" مجھے حیرت ہوئی تھی۔

اور پھر وہ بہ دقت تمام تصویر بنانے لگی۔

میری مہرالنساء ہتھیلی ٹھوڑی تلے رکھے، فاتحانہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایسے مجھے تب دیکھا تھا، جب نائمہ نے میرے سامنے بدزبانی کی تھی۔

"آپ کی مومو بہت اچھی ہے سر! آپ اپنی مومو کو منا لیں پلیز۔" تصویر بناتے بناتے وہ بولی تھی، میں جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کافی دیر بعد ماریہ نے تصویر مکمل کر لی۔

"کیسی ہے سر؟" اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"بہت اچھی۔" میں نے سفید کاغذ کو ہاتھ میں لیے اس پر بنا اسکیچ دیکھا۔ وہ نوے فیصد مومو سے مشابہت رکھتا تھا۔

"اب کلرز کرو گی، اس میں؟"

"نہیں میں تھک گئی ہوں۔" اس نے تھکاوٹ سے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔

میں آہستہ آہستہ اس کا سر تھپکنے لگا، جب وہ نیند کی آغوش میں جانے لگی تو اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ "میں زندہ رہوں گی نا سر؟"

"میری مومو کو کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہہ دیا، مگر میرے اندر بہت خوف تھا۔

ساری رات میں اس کے پاس بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ وہ چھوٹی سی بچی میرے کندھے پر سر رکھ کر سو رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔

وہ نیند میں تھی، جب ڈاکٹرز اسے لینے آئے، میں اب ایک اٹینڈنٹ بن گیا تھا۔ انہوں نے اسے نیند میں ہی انستھیسیا دیا تھا، حالانکہ میری خواہش تھی کہ وہ اسے جگا دیتے اور میں چند ایک باتیں ماریہ سے کر لیتا، میں نے مومو کا اسکیچ جو مومو نے بنایا تھا، اپنی جیب میں ڈال لیا۔

مسلسل تین گھنٹے ماریہ کا آپریشن ہوتا رہا، تین گھنٹے میں ہسپتال کے سرد، ویران کاریڈور میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ میرے قریب سے آرمی یونیفارم میں ملبوس نرسیں اور ڈاکٹرز گزرتے رہے تو کوئی میری پریشان صورت دیکھ کر تسلی کے دو لفظ بول دیتا تو کوئی ترحم بھری نگاہ ڈال کر چلا جاتا۔

بالآخر میں تھک کر ماربل سے بنے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔ سردی کا کوئی احساس مجھے نہیں ہو رہا تھا، میرا رواں رواں ماریہ کے لیے دعا گو تھا۔

تین گھنٹے کا وہ طویل انتظار، بمشکل کٹ ہی گیا اور آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔ کرنل ڈاکٹر عابد بیگ باہر نکلے۔

"آپ بچی کے والد ہیں؟" انہوں نے چہرے پر سے ماسک اور ہاتھوں سے گلوز اتارتے ہوئے مخاطب کیا۔

"نہیں، مگر میں اس کا انکل ہوں۔ کیسی ہے وہ؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"دیکھیے، اس کا تھائی رائیڈ گلینڈ ریموو کرنا تھا، تھائی رائیڈ گلینڈ کے پیچھے ایک Nerve

ہوتی ہے اور..."

"مجھے بتائیں ماریہ کیسی ہے؟" میں نے بے چینی سے ان کی بات کاٹی۔

انہوں نے گہری سانس بھری۔ "وہ جو خاص رگ ہوتی ہے نا، وہ ان کی آپریشن کے دوران کٹ گئی ہے۔ آئی ایم سوری، ماریہ کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ دراصل اس رگ کو کٹنے سے بچانا بہت مشکل تھا۔"

وہ کیا کچھ کہہ رہے تھے؟ میں سن نہیں پا رہا تھا، مجھے سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ بہت کچھ میرے ذہن میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔

میری کلاس روم میں کھڑکی کے ساتھ رکھی وہ کرسی خالی تھی۔ وہ کرسی ماریہ کا انتظار کر رہی تھی اور ڈاکٹر کہہ رہا تھا، ماریہ مر گئی؟ ماریہ کی ڈیتھ ہو گئی؟ بالکل ایسے ہی ڈاکٹر ہاشمی کی بہو نے کہا تھا، حیدر کی ڈیتھ ہو گئی، حیدر مر گیا! بس اس ایک لفظ کا ناتا تھا زندگی اور موت کے درمیان؟ وہ مر گئی؟ وہ مر گیا؟

کیوں قدرت اتنی ظالم ہوتی ہے؟ ماریہ کو کیوں مار ڈالا؟ کیا مانگا تھا، اس لڑکی نے زندگی سے سوائے اپنے رنگوں، خوشبوؤں اور تتلیوں کے؟ وہ کیوں مر گئی؟

میرے سامنے اسٹریچر پر اس کی میت سفید چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ میں نے لرزتی انگلیوں سے چادر کا سرا اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ سفید، ساکت چہرہ۔

کتنی امید دلائی تھی میں نے اسے، کتنے جھوٹ بولے تھے، میں نے اس سے، کتنی بار کہا تھا۔ "تم بچ جاؤ گی مومو! تمہیں کچھ نہیں ہوگا، اور وہ مجھ پر یقین کر کے کتنے سکون سے آپریشن تھیٹر چلی گئی تھی؟ کئی برس ہوئے، ایک مومو مجھ سے ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ اور آج، ایک دوسری مومو مجھ سے دور جا چکی تھی۔ کیوں مجھے سب چھوڑ کر جاتے ہیں؟

میں ہمیشہ آخر میں تنہا کیوں رہ جاتا ہوں؟

* * *

ماریہ کے چلے جانے کے بعد میں نے کسی کو اس کھڑکی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ کرسی خالی رہی۔ مجھ سے میرے اسٹوڈنٹس نے کبھی میرے اس عمل کی وجہ دریافت نہیں کی۔ ایک Batch ختم ہوتا تو دوسرا آ جاتا۔ مدھم سرگوشیوں میں پرانے طلبہ نئے

آنے والوں کو آگاہ کرتے تھے۔ "یہ مومو کی سیٹ ہے۔ وہ کینسر سے مرگئی تھی۔ یہ اس کی جگہ ہے، یہاں کسی نے نہیں بیٹھنا۔ سر کو دکھ ہوگا۔" اور نئے طلبہ سمجھ کر سر ہلا دیتے۔

ماریہ کی موت کے تین برس بعد جب میں نے کلاس کا فرنیچر بدلوایا تو وہ کرسی وہاں سے نہیں اٹھوائی۔ کھڑکی کے ساتھ وہ ویسی ہی پڑی رہی۔

اس دوران میں نے ایم فل کر کے آرٹ کے شعبے ہی کو پی ایچ ڈی کے لیے منتخب کیا، جب پی ایچ ڈی مکمل ہوا تو میں نے یونیورسٹی میں بطور، آرٹ ڈائریکٹر کے جوائن کرلیا۔

میری اکیڈمی اب بھی جاری تھی اور کھڑکی کے ساتھ والی کرسی اب بھی خالی تھی، مومو اور مومو کی کرسی میری اکیڈمی میں لیجنڈ کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔

* * *

سیاہ مگ میں دو کپ کے برابر کافی پھینٹ کر میں نے آزردگی سے اسے دیکھا تھا۔ ان تمام پچھلے برسوں میں، میں روز صبح دو کپ کافی پھینٹتا تھا۔ اپنے کپ میں دودھ اور چینی ڈال کر پیتا، جب کہ دوسرے کپ میں پھینٹی ہوئی کافی رہنے دیتا...... شاید کہ وہ پلٹ آئے، مگر ہر دن کے اختتام پر جب مومو کہیں نہ ہوتی، تو میں بے حد مایوسی سے اس کی کافی سنک میں بہا دیتا تھا۔

آج میں نے کافی اس کے کپ میں ڈالنے سے پہلے ہی بہا دی، اب کیوں اور کس کا انتظار کروں۔ گیارہ برس کسی کو بھولنے کے لیے کافی ہوتے ہیں، وہ کیوں واپس آئے گی؟ کیا رکھا ہے، اس کے لئے یہاں؟

میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ آئندہ اس کی کافی نہیں بناؤں گا۔ وہ اب نہیں آئے گی، وہ کبھی نہیں آئے گی۔

"شاید دودھ والا ہو۔" میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل کر دیکھنا چاہا، مگر ایک لمحے کو تو زمین نے میرے قدم جکڑ لیے۔

میرے سامنے، میرے گھر کے باہر، میرے دروازے پر مومو کھڑی تھی۔ مومو...... میری مومو...... میری مہر النساء میں نے پلکیں زور سے جھپک کر اسے دیکھا، وہ کوئی الوژن نہیں تھا، وہ میری مہر النساء ہی تھی۔

ہلکے آسمانی قمیص شلوار پہنے، کندھے پر ہم رنگ دوپٹہ ڈالے، وہ مومو ہی تھی۔

اس کا چہرہ پہلے سے قدرے میچور لگ رہا تھا۔ بال اب ویسے لمبے نہیں تھے، بلکہ کندھوں سے بھی قدرے اوپر تھے۔

اس نے بھورے بالوں میں blonde اسٹریکنگ کرائی ہوئی تھی اور ان کو کیچر میں ایسے باندھ رکھا تھا کہ چند لٹیں چہرے کے اطراف میں بکھری ہوئی تھیں۔

دروازہ کھلنے پر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"مومو" اس لمحے مجھے اتنی خوشی ہوئی تھی کہ مجھے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا تھا۔ میری مومو، میری مہر النساء واپس آگئی تھی۔

"السلام علیکم سر!" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"وعلیکم السلام۔" خوشی کے مارے مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

"آؤ...... اندر آؤ" میں نے راستہ چھوڑ دیا۔

وہ آہستہ سے چلتی ہوئی اندر آگئی، اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں کوئی تہہ شدہ کپڑا اٹھا رکھا تھا، میں نے دھیان نہیں دیا۔

"آؤ بیٹھو" میں نے لونگ روم میں رکھے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ وہ طائرانہ انداز سے اطراف کا جائزہ لیتی ہوئی نہایت نزاکت سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں جلدی جلدی اس کے لیے کافی پھینٹنے لگا، اگر میں چند لمحے پہلے اس کے حصے کی کافی نہ گراتا تو کم از کم اسے دکھا کر مرعوب و متاثر کرسکتا تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھی، اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ اب میرا لونگ روم پہلے کی نسبت بے حد صاف ستھرا ہوتا تھا۔

دفعتاً اس کی نگاہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی، گولڈ لیف کی ڈبیہ پر پڑی۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "یہ چھوڑی نہیں ابھی تک؟"

کافی پھینٹتے ہوئے میں مسکرایا۔

"بہت کچھ چھوڑ دیا ہے مومو! مگر اس کو نہیں چھوڑا۔"

اس نے سر ہلا دیا، مگر وہ شاید میرے لہجے پر غور کررہی تھی۔

اس کے کپ میں دودھ ڈال کر میں نے دونوں کپس ٹرے میں رکھے۔ ساتھ شوگر پاٹ رکھا

اور سینٹر ٹیبل پر لا کر ٹرے رکھ دی۔ اس نے خود ہی آگے بڑھ کر شوگر پاٹ اٹھا لیا اور ایک چمچہ میرے کپ میں ڈال کر آدھا اپنے میں ڈالا۔

"تمہیں، تمہیں یاد تھا مومو؟" میرے من میں نغمے سے گونج اٹھے تھے۔

"میں کچھ بھولی ہی کب ہوں؟" اپنے کپ میں چمچہ ہلاتے ہوئے وہ پلکوں کی باڑ جھکا کر بولی۔

میں نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ وہ بنائی میں نے تھی، مگر اس میں چینی مومو نے مکس کی تھی، ایک دم سے بہت ذائقہ آ گیا تھا اس میں۔

"کیسے ہیں آپ سر؟" چند گھونٹ بھر کر اس نے سادگی سے پوچھا۔

"ویسا ہی جیسا تم چھوڑ کر گئی تھیں۔"

اس نے گہری سانس بھری اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔

"آپ کی وائف کہاں ہیں؟ سو رہی ہیں؟ میں جلدی آ گئی نا؟"

میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "میں نے شادی نہیں کی مومو!"

کافی کا کپ لبوں کی طرف لے جاتے ہوئے اس کے ہاتھ یکدم ساکت سے ہو گئے۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر بے حد شاکڈ سی ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

"جی؟"

"میں نے شادی نہیں کی" میں نے سر جھٹک کر دہرایا۔

پھر دفعتاً اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ "کیوں، سر؟"

میں نے شانے اچکا دیے۔ "کوئی ملی نہیں۔"

اس نے سر جھکا۔ میں نے بات کا رخ بدل کر پوچھا۔

"کب سے آئی ہوئی ہو ادھر؟"

"سات...... یا آٹھ، نہیں، شاید سات......" وہ ذہن میں حساب کر رہی تھی۔

"اچھا...... یعنی ہفتہ ہو گیا ہے۔"

اس نے گہری سانس کو اندر کھینچ کر مجھے دیکھا، پھر نفی میں گردن ہلائی۔

"آٹھ دن نہیں، آٹھ ماہ ہو گئے ہیں۔"

میں نے بے یقینی کے عالم میں کپ میز پر واپس رکھا۔

"تم آٹھ ماہ سے ادھر ہی ہو؟"

"ادھر نہیں، لاہور میں تھی، پڑھ رہی تھی، ایف ایس سی بھی یہیں سے کی۔"

"اور کینیڈا میں پڑھائی نہیں کی؟"

اس کا چہرہ پل بھر کو تاریک سا ہوا تھا۔

"نہیں سر دادو کی ڈیتھ کے بعد کینیڈا سے واپس لاہور آ گئی تھی، کینیڈا سے تو دو سال بعد ہی واپس آ گئی تھی۔ وہاں پڑھائی نہیں کی تھی۔"

مجھے یاد آ گیا تھا۔ "مومو مجھے حیدر کا بہت......" میں پل بھر کو رکا "کیسے تعزیت کروں؟ وہ تو میرا دوست تھا...... میں" میں کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"اسے کیا ہوا تھا مومو؟"

"انجائنا کا ایک اٹیک تھا، ہم اسپتال لے کر گئے، مگر ایمبولینس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا، پاپا کی ڈیتھ ہو گئی، مجھے چوٹیں آئی تھیں۔" وہ سر جھکائے بتا رہی تھی۔

"اور تم لوگ کینیڈا چلے گئے؟ میرا انتظار بھی نہیں کیا۔" میں نے شکوہ کیا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر حیران نظروں سے مجھے دیکھا۔

"انتظار؟ پاپا نے انتظار ہی تو کیا تھا، آپ کا روز صبح شام چکر لگاتے تھے، وہ آپ کے گھر کے۔ مگر آپ نہیں آئے۔ دو ماہ تک وہ آپ کے گھر کے چکر لگاتے رہے۔ دو ماہ میں ساٹھ دن ہوتے ہیں سر! اور پھر دادو نے بھی آپ کا انتظار کیا تھا، لیکن جب وہ آپ کی جانب سے بالکل مایوس ہو گئیں تو ہم سبین خالہ کے ساتھ چلے گئے۔" وہ قدرے توقف سے ٹھنڈی ہوتی کافی پر نگاہیں جما کر بولی۔

"آپ کب آئے تھے سر؟"

"تمہارے جانے کے اگلے روز!"

"کیا، کیا آپ نے ان ساڑھے دس، گیارہ سالوں میں؟" اس کے انداز میں برسوں کی مسافت کی تھکاوٹ تھی۔

"میں نے آرٹ اکیڈمی کھول لی، پھر پی ایچ ڈی کی اور اب اکیڈمی کے ساتھ یونیورسٹی

میں پڑھاتا بھی ہوں۔''

''آرٹ اکیڈمی۔'' اس نے حیرت سے مگ میز پر رکھا۔

''تمہیں رنگوں سے کھیلنا اچھا لگتا تھا نا، میں نے تمہارے لیے اکیڈمی کھولی مومو!'' میں کرب سے مسکرایا۔

''تمہارے ہاتھ کہتے تھے کہ تم پینٹر بنو گی۔''

''میرے ہاتھ تو یہ بھی کہتے تھے کہ میں سرجن بنوں گی۔''

''تو......؟''

اس نے گود میں رکھا سفید سا کپڑا میرے سامنے کیا۔ وہ ایک آوورآل تھا۔

''مومو۔'' میرے لبوں سے صرف اتنا ہی نکلا تھا۔

''میں پینٹر نہیں بن سکی سر! میں سرجن ڈاکٹر بن گئی ہوں، ایک برس پہلے تعلیم سے فارغ ہوئی ہوں، پہلے کچھ عرصہ گنگارام میں جاب کی، پھر ادھر آ گئی۔

''تم......'' میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ اس نے ان رنگوں کو بھلا دیا تھا، جن سے میں نے پچھلے اتنے برسوں بے تحاشا محبت کی تھی۔

''میں پچھلے کئی برس اپنی فطرت کے خلاف بھاگتی رہی ہوں سر! اور اب......'' وہ دکھی دل سے مسکرائی۔

''اب تھک گئی تھی، اسی لیے واپس آ گئی۔''

''تمہارے ہزبینڈ اور فیملی؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر میری جانب دیکھتی رہی، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں نے شادی نہیں کی۔'' وہ سر جھکائے بولی۔ اس کی آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔

''کیوں؟'' مجھے طمانیت بھی ہوئی تھی اور حیرت بھی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''کوئی ملا نہیں۔'' پھر اپنا آوورآل اٹھا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

''چلتی ہوں سر! آپ کی اکیڈمی آؤں گی۔''

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے قدرے دکھ سے اس کے آوورآل کو دیکھا۔ ''تمہیں تو پینٹر

بننا تھا، مومو!''

''زندگی میں سب کچھ غیر متوقع ہی ہوتا ہے، سر!''

وہ مغموم انداز میں کہہ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

''مومو!''

آدھا دروازہ کھول کر اس نے پلٹ کر مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ ''کچھ نہیں۔''

''کہہ ڈالیں سر! آپ ہمیشہ باتیں ان کہی چھوڑ دیتے ہیں۔'' وہ بہت پرسکون انداز میں بولی تھی۔

''تم یقین نہیں کرو گی۔''

وہ کھل کر مسکرائی۔ ''کیا یہی کہنا چاہتے ہیں کہ آپ میرے گھر روز شام کو چھ بجے آیا کرتے تھے؟'' میں مبہوت سا ہو کر اسے دیکھے گیا۔

''تمہیں کیسے پتہ مومو؟''

''بعض عادتیں فطرت بن جاتی ہیں سر! جب میں سین خالہ کے غیر مانوس گھر کی غیر مانوس لائبریری میں شام چھ بجے آپ کے انتظار میں کتابیں کھول لیا کرتی تھی تو آپ تو پھر بھی ان مانوس رستوں پر سفر کرتے تھے، کب تک آتے رہے تھے، میرے گھر؟''

''دو سال تک؟''

اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔ میں وہیں ساکت سا کھڑا دروازے کو دیکھتا رہا۔

* * *

اس شام میں اپنی کلاس کو پڑھا رہا تھا، جب ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ میری نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔ تمام اسٹوڈنٹس نے میری نظروں کے تعاقب میں دروازے کو دیکھا، وہاں ایک دلنشین مسکراہٹ لبوں پر سجائے مومو کھڑی تھی۔

''میں آ جاؤں سر؟'' اس نے شرارت چھپاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"اسٹوڈنٹس! یہ آپ کی نئی کلاس فیلو ہیں، ڈاکٹر مہر النساء حیدر!" میں نے اس نازک سی لڑکی کا تعارف کرایا اور ڈاکٹر صاحبہ یہ میرے بہت اچھے اسٹوڈنٹس ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان کو تنگ نہیں کریں گی۔" میرے لہجے کی شرارت پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بالکل نہیں کروں گی، میں بیٹھ جاؤں سر؟" اس نے بچوں کی طرح اجازت مانگی۔ میں نے مسکراہٹ چھپا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کرسیوں کی جانب بڑھ گئی۔ تمام کلاس بھری ہوئی تھی۔ کرسی صرف ایک ہی خالی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ رکھی لکڑی کی، وہ کرسی جو دوسرے فرنیچر سے میچ نہیں کرتی تھی۔ مومو اس کرسی کی جانب بڑھ گئی۔ جس لمحے وہ وہاں بیٹھنے لگی، ساتھ والی نشست پر بیٹھی اٹھارہ سالہ اسماء نے پریشان ہو کر اسے روکا۔

"آپ ادھر نہ بیٹھیں۔"

مومو بیٹھتے بیٹھتے رک گئی۔ "مگر یہاں اور کوئی خالی ہی نہیں ہے، یہ کیا کسی کی جگہ ہے؟"

اسماء نے میری جانب دیکھا اور پھر آہستہ سے مومو کو مخاطب کیا۔ "یہ سیٹ مومو کی ہے، سر اس پر کسی کو نہیں بیٹھنے دیتے۔" اسماء کی مدھم سرگوشی مجھے سنائی دے رہی تھی۔

"مومو؟" مومو نے بے حد چونک کر اسماء کو دیکھا۔

"سر کی کوئی چھوٹی سی بچی فرینڈ تھی، اس کا نک نیم مومو تھا۔" ایک دم مومو کھل کر مسکرائی اور اپنا پرس اسی کرسی کے بازو سے لٹکا کر اس پر بیٹھ گئی۔

"تمہیں پتا ہے یہ میری سیٹ ہے۔" اس نے اسماء کو کہہ کر میری جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں خوشی، بے یقینی اور تشکر تھا۔ چند اسٹوڈنٹس نے پریشان سا ہو کر مومو کو دیکھا۔

"اٹس او کے...... یہ مومو کی سیٹ ہے۔ بیٹھی رہو، مومو!" میں نے مسکرا کر کہا۔

مومو بہت خوش تھی، وہ جو سمجھ رہی تھی، کیا وہ مجھے بتانے کی ضرورت تھی۔

کلاس ختم ہونے کے بعد مومو میرے پاس آئی۔ تمام اسٹوڈنٹس باہر جا رہے تھے، میں اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

"سر! آپ مجھے ڈراپ کر دیں گے؟" اس نے اپنا پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

"ہاں شیور!" میں نے اپنا سامان سمیٹ کر چھوٹے سے بیگ میں ڈالا، پھر ایک خیال کے

تحت پوچھا۔ "آئی کیسی ہو؟"

"ٹیکسی سے!"

"مومو!" میں نے برہمی سے اسے دیکھا۔ "اگر تمہارے پاس گاڑی نہیں تھی تو مجھے کہہ دیتیں، میں تمہیں پک کر لیتا۔ ٹیکسی میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت تھی؟ اب خبردار جو آئندہ تم نے پبلک ٹرانسپورٹ یوز کی تو۔"

وہ مسکراتے ہوئے میرے ساتھ باہر آ گئی۔

"تو آپ کو میری پروا ہے سر؟"

میں نے ایک لمحے کو رک کر اسے خفگی سے دیکھا۔

"کیا تمہیں واقعی یقین دہانی کی ضرورت ہے؟"

"نہیں سر!" وہ فوراً بولی۔ "I Know You Care"

میں نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ کا لاک کھولتے ہوئے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم میری زندگی میں سب سے اہم شخص ہو مومو! بلکہ میری زندگی میں صرف تم ہی تو ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

* * *

روز یونیورسٹی جاتے ہوئے مومو کو اسپتال چھوڑ دیتا اور واپسی پر پک بھی کر لیتا۔ اس کا شیڈول روز بدلتا رہتا تھا، مگر میں ہمیشہ اس کے لیے حاضر رہتا تھا۔

اس روز جب اس کی اڑتالیس گھنٹے کی ڈیوٹی کے اختتام پر میں لینے گیا تو وہ بہت تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

''اتنی لمبی ڈیوٹی؟'' میں نے فرنٹ سیٹ پر تھکی ہاری بیٹھی مومو پر ایک نگاہ ڈالی۔

''میری تو کل ہی ختم ہوگئی تھی، مگر ڈاکٹر افشاں کو کہیں جانا تھا، اس لیے میں اس کی جگہ ڈیوٹی کر رہی تھی۔''

''ایک تو تمہاری مروت بھی نا!'' مجھے اس پر بے حد غصہ آیا تھا۔ ''خوامخواہ دوسروں کے پیچھے خود کو ہلکان نہ کیا کرو۔''

''تو کیا ہوتا ہے سر؟ ہم دوسروں کے کام آ جائیں، اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے؟'' وہ سہولت سے بولی۔

''افسانوی بات مت کرو مومو! خبردار جو آئندہ تم نے کسی اور کی جگہ ڈیوٹی کی۔'' میں نے گاڑی آہستہ کر لی۔ بینک قریب ہی تھا، مجھے بینک سے ایک ڈرافٹ نکلوانا تھا۔

''تم گاڑی پارک کرو ذرا، میں اپنا کام کر لوں، بینک بند ہی نہ ہو جائے۔'' گاڑی کی چابی اسے تھما کر میں تیزی سے نکلا اور تقریباً بھاگتا ہوا بینک میں داخل ہوا۔

پانچ منٹ بعد ہی جب میں اپنا کام ختم کر کے باہر آیا تو پارکنگ ایریا میں عجب سماں تھا۔

''میرا دس ہزار کا نقصان کر دیا ہے آپ نے...... اب مجھے بتائیں، میرا نقصان کون پورا کرے گا؟ آپ کو گاڑی نہیں ڈرائیو کرنی آتی تو کرتی کیوں ہیں؟ بہتر ہے کہ آپ کسی ڈرائیونگ

انسٹی ٹیوٹ میں جا کر چند دن کچھ سیکھ ہی لیں۔''

میری سفید کرولا کے سامنے کھڑی مومو، چپ چاپ نچلا لب کچلتے ہوئے ایک درمیانی عمر کے آدمی کی ڈانٹ سن رہی تھی، میں نے ناگواری سے اس آدمی کو دیکھا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں اس آدمی کو مخاطب کیا۔ اس غصیلے آدمی نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ ''ان محترمہ نے اپنی گاڑی ریورس کرتے ہوئے، میری گاڑی کی بیک لائٹس توڑ دی ہیں، خدا کی پناہ میں.....''

''محترم، ایک منٹ، مجھے ان سے پوچھ لینے دیں۔'' میں نے مومو کو دیکھا۔ ''ہاں بتاؤ، کیا ہوا ہے؟''

''سر! ان کو غلط فہمی ہوئی ہے، وہ میری گاڑی نہیں تھی، وہ والی کرولا تھی۔'' اس نے اپنے دائیں جانب ہو بہو میری کرولا کی سی ماڈل ساخت اور رنگ والی گاڑی کی جانب اشارہ کیا، جس میں سے ایک فیملی نکل رہی تھی۔

درمیانی عمر کے آدمی نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا، پھر اس دوسری سفید کرولا کی جانب بڑھ گیا۔

''سوری! سر معاف کیجئے گا، مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔''

چند لمحوں بعد وہ غصیلا آدمی جھاگ کی طرح بیٹھ کر ہم سے معذرت کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' سرد مہری سے کہہ کر میں نے مومو کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

تمام راستہ میں لب بھینچے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ مجھے اس وقت مومو پر اتنا غصہ چڑھ رہا تھا کہ بہتر تھا، میں خاموش ہی رہتا۔

اس کے گھر کے سیاہ آہنی گیٹ کے باہر گاڑی روک کر میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

''خدا حافظ۔''

اس نے قدرے شرمندگی سے مجھے دیکھا۔ اس کا بایاں ہاتھ لاک پر تھا، مگر اس نے لاک نہیں کھولا۔ ''سر!''

''خدا حافظ!'' میں بدستور اسٹیئرنگ وہیل کو دیکھ رہا تھا۔

''ناراض ہیں، سر؟'' اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

"ناراض؟" میں نے ایک جھٹکے سے اس کی جانب چہرہ کیا۔ "مجھے تم پر غصہ آ رہا ہے۔ مومو! ایک شخص بھرے بازار میں تمہاری انسلٹ کرتا ہے اور تم گونگی بن کر سنتی رہتی ہو۔ زبردست!"

"میں اس کے خاموش ہونے کا انتظار کر رہی تھی!"

"خود سے کوئی خاموش نہیں ہوا کرتا مومو! غلط کہنے والے کو خاموش کرانا پڑتا ہے۔"

"پر وہ بول رہا تھا، میں بیچ میں کیسے بولتی؟"

"تم اب بڑی ہوگئی ہو ڈاکٹر مہر النساء! پریکٹیکل لائف میں اگر تم سچی ہونے کے باوجود دوسروں کی لعن طعن سنتی رہو گی تو اس سے تمہارے خلیل جبران کے اقوال سچے ثابت نہیں ہو جائیں گے، بلکہ لوگ تمہیں شرمندہ سمجھ کر اور اونچا بولیں گے۔ خود کو ڈیفینڈ کرنا سیکھو، مومو!"

"رائٹ سر!" وہ تابعداری سے سر ہلا کر گاڑی سے اتر گئی، مگر مجھے علم تھا کہ میں جتنا سر پیٹ لوں، وہ کبھی بھی اپنی اس سب سے بڑی کمزوری پر قابو نہیں پا سکتی۔

* * *

"ارے!" صبح مومو کو جاگنگ ٹریک پر دیکھ کر، میں جو بینچ پر بیٹھا سانس ہموار کر رہا تھا، خوشگوار حیرت سے بول اٹھا۔

"ڈاکٹر مہر النساء اور جاگنگ؟"

"ڈاکٹر حسان اور ریسٹ؟" اس نے میرے یوں بینچ پر بیٹھنے پر تاک کر حملہ کیا تو میں بے اختیار ہنس دیا۔

"اب ڈاکٹر حسان بوڑھے ہوگئے ہیں مومو بی! اب ریسٹ کرنا پڑتا ہے۔"

وہ میرے ساتھ بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس بنچ کے پیچھے لگے درخت کی ٹہنیاں قدرے جھک کر ہمارے سروں پر سایہ کر رہی تھیں۔ بادِ صبا کے خوشگوار جھونکوں سے ٹہنیوں پہ لگے پتے پھڑ پھڑا سے جاتے تھے۔ مومو نے ہاتھ بڑھا کر ایک پتا توڑ لیا، پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین پر گرانے لگی تو میں نے ایک نظر اس کے سفید ہاتھوں اور ان کے درمیان پکڑے پتے پر ڈالی۔

"آپ کو یاد ہے سر! ہم روز ادھر بیٹھا کرتے تھے۔" وہ پتے کو دیکھتے ہوئے دور کہیں کھو گئی تھی۔

"مجھے کچھ بھی نہیں بھولا مومو!" میں نے قدرے تھک کر ٹیک لگا لی۔

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی، سر؟" اس کے لہجے میں الجھن تھی، وہ سر جھکائے قدرے آگے ہو کر بیٹھی، پتے کے ٹکڑے کر رہی تھی۔ اس کے کندھوں پر اس کے بھورے Streaking شدہ بال لہرا رہے تھے۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا، کوئی ملی نہیں۔" میرے لہجے میں آزردگی سمٹ آئی۔

اس نے پتے کا آخری ٹکڑا بھی زمین پر پھینک دیا۔ میں نے اس کے سپید ہاتھوں کو دیکھا اور ایک دم میری نگاہیں ایک چیز پر ٹھہر سی گئیں۔ میں یک ٹک اس کی کلائی کو دیکھے گیا، وقت جیسے رک سا گیا تھا۔

اس کی مرمریں کلائی میں وہ پنک گھڑی آج بھی موجود تھی، اس کا رنگ پھیکا ہو چکا تھا۔ اس کے ڈائل نے وقت بتانا چھوڑ رکھا تھا، مگر مومو نے اب بھی اسے خود سے جدا نہ کیا تھا۔ اسی پنک رنگ کی گھڑی نے آخر مجھ سے وہ کہلوا دیا، جو میں خود سے کہنے سے بھی ڈرتا تھا۔ جو میں حیدر سے کہنے سے بھی ڈرتا تھا اور جو میں مومو سے کہنے سے بھی ڈرتا تھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی مومو؟" اس خوب صورت پارک کے سنگی بنچ پر بیٹھے نگاہیں اس پنک رسٹ واچ پر جمائے، مجھے دنیا والوں کا خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنی اڑتالیس برس کی عمر کے باوجود ایک چھبیس، ستائیس سالہ لڑکی کو پرپوز کرتے ہوئے کسی کا ڈر نہیں تھا۔

مومو نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کیا آپ کو واقعی مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہے سر؟"

اس کا لہجہ شاکی تھا۔

اور بالآخر میں نے مہر النساء کو پا ہی لیا تھا۔

* * *

میری اور مومو کی شادی 26 نومبر، 1997ء کو بہت سادگی سے ہوئی تھی۔

تمام گیدرنگ مومو کے گھر پر تھی، میری جانب سے میرے چند دوست تھے، رشتے داروں سے تو میں کب سے کٹا ہوا تھا۔ اور آنٹی کی وفات کے بعد مومو بھی کٹ گئی تھی، سو اس کی طرف سے بھی چند کولیگ ڈاکٹرز ہی تھے۔

البتہ سبین کینیڈا سے اسپیشل آئی تھی، مومو کو تیار بھی اس نے ہی کیا تھا۔

جب میں نے حیدر کے گھر کے ڈرائنگ روم میں سبین کو سجی سنوری مومو کا ہاتھ تھام کر اندر لاتے دیکھا تو ایک پل کو تو میں مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔

لائٹ پنک اور سلور رنگ کی کامدار شلوار قمیص میں ملبوس نازک جیولری پہنے، اس نازک سی لڑکی کے حسن کو ذرا سے میک اپ نے دوآتشہ کر ڈالا تھا۔ باوجود اونچے جوڑے کے، اس کے ماتھے پر گولڈن براؤن اسٹریک شدہ، کٹے ہوئے بال نکل ہی آئے تھے۔ پہلی دفعہ میں نے مومو کو قدرے سمٹی سمٹی اور نگاہیں جھکائے دیکھا تھا۔

بلیو ساڑھی میں ملبوس سبین نے مومو کو سہارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا۔ یہ وہی صوفہ تھا، جہاں بیٹھ کر برسوں پہلے مومو بہت روئی تھی۔

''بیٹھ جاؤ، حسان!'' سالیوں کے سے شرارتی انداز میں سبین نے مجھ سے کہا۔ وہ میری سالی تھی، کم از کم وہ خود یہی کہہ رہی تھی، حالانکہ وہ مومو کی خالہ لگتی تھی۔

میں مومو کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ گود میں دھرے تھے۔ ان میں سے مہندی کی تازہ تازہ، بھینی بھینی سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

جوتا چھپائی، دودھ پلائی، ڈھولک، ایسا کچھ نہ ہوا۔ اس عمر میں مجھے وہ سب بہت بچکانہ لگ رہا تھا۔ بس چند ایک تصاویر اتاری گئیں، جو سبین نے ہی اتاری تھیں۔

رخصتی کے وقت مومو، سبین کے گلے لگ کر خوب روئی تھی، حالانکہ مجھے مومو سے یہ امید نہیں تھی، مگر وہ بہرحال روئی تھی۔

''خالہ! مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے مگر......'' وہ سبین کے گلے لگ کر آنسو بہاتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

''غیروں جیسی باتیں کیوں کرتی ہو...... مومو! تم تو میری بیٹی ہو۔ مائیں تو بیٹیوں کے لیے بہت کچھ کرتی ہیں۔''

سبین نے ساڑھی کے پلو سے آنکھیں خشک کیں۔ ''اچھا اب اپنے کزنز سے تو ملو۔''

مومو، مائی حلیمہ اور پھر اپنے تینوں کزنز سے خوب پیار سے ملی اور اپنے آنسو صاف کیے۔

میں نے ہولے سے مومو کا بازو تھاما۔ ''اب مومو میرے حوالے کرو، سبین تم فکر مت کرو۔''

سبین بھیگی آنکھوں سے مسکرا دی۔

یوں میری زندگی کے اس بہترین دن، خوشبوؤں میں بسی مومو میرے ساتھ رخصت ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے گھر آ گئی۔

* * *

''لیں یہ کاٹیں میں ذرا گوشت دھولوں۔'' پیاز کی پلیٹ چھری سمیت، اس نے میرے سامنے میز پر رکھی اور خود کچن میں چلی گئی۔

میں نے اخبار سے نظر ہٹا کر، ایک لمحے کو پیازوں کی پلیٹ کو دیکھا، پھر گردن پھیر کر پیچھے بنے کچن میں سنک کے آگے گوشت کو دھوتی مومو کو۔

''تمہارا مطلب ہے کہ میں، یعنی میں ڈاکٹر حسان رضا پی ایچ ڈی پیاز کاٹوں؟'' مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

''جی ہاں میرا یہی مطلب ہے۔'' اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

وہ گھر کے کپڑوں میں ملبوس تھی، بالوں کی پونی بنا رکھی تھی، مگر ماتھے والے بال پھر بھی چہرے پر آ رہے تھے۔ دوپٹہ گلے میں تھا اور آستین کہنیوں تک فولڈ کیے ہوئے تھے۔

''آر یو سیریس؟'' میں مصنوعی حیرانی سے چیخا تھا۔

''جی ڈاکٹر صاحب! مجھے بریانی بنانی ہے، اس کا مسالا تیار کرنا ہے اور پیاز آپ کاٹیں گے۔'' وہ تیزی سے گوشت کو دھو کر ٹوکری میں ڈالتے ہوئے نگاہیں، اپنے کام کی جانب مرکوز کیے کہہ رہی تھی۔

''واہ! مجھے کیا پتہ تھا کہ تم مجھ سے شادی کے دوسرے ہفتے ہی کام بھی کروانا شروع کر دو گی؟ وہ بھی پیاز اف؟'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے پیاز اٹھا لیے۔

''اتنی ساری پیاز سے تم ہم دو لوگوں کے لیے کھانا بناؤ گی؟'' میں نے چھری سنبھال لی مگر اپنی پیاری بیوی کو طعنے دینا نہ بھولا۔

''نہیں صرف ہمارے لیے نہیں۔ ساتھ میں مسز فاروق کے گھر بھی بھجوانے ہیں۔ اصل میں ان کا فون آیا تھا، ان کی نوکرانی نہیں ہے نا۔''

''تو انہوں نے تم سے یہ کہا کہ تم ان کو بریانی بنا کر بھیج دو؟ لاحول ولاقوۃ۔''

میں نے سر جھٹکا دیا۔

''ارے نہیں وہ کیوں کہتیں۔انہوں نے تو یونہی ذکر کیا تھا۔میں نے کہا تھا،کھانے کی فکر ہی نہ کریں، میں بنا کر بھیج دوں گی۔ بے چاری اتنا شکریہ ادا کر رہی تھیں، مجھے تو شرمندگی ہونے لگی تھی۔''

''استغفراللہ مومو!وہ اپنا کام نکلوانے والی بے چاری ہیں اور شرمندہ تم ہو رہی تھیں۔''میں نے پیازوں کا چھلکا اتارتے ہوئے اسے ٹوکا تھا۔

''اف او۔ایسے تو نہ کہیں حسان!''ٹماٹر کاٹتے ہوئے اس نے قدرے برا مان کر مجھے دیکھا۔وہ اب مجھے حسان کہتی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے تو اب یہ باقی بریانی تم مسز فاروق کو بھیجو گی؟''

پیاز کاٹتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو آ رہے تھے۔آواز بھی بھیگ سی گئی تھی۔

''ساری نہیں۔مسز طاہر کو بھی تو بھجوانی ہے۔''میں تنک کر اسے دیکھا۔''یہ کون ہیں؟''

''وہی طاہر صاحب کی بیگم۔نئی نئی شادی ہوئی ہے، جن کی۔وہ جو ابھی پرسوں ہی یہاں شفٹ ہوئی ہیں۔''مجھے یاد دلاتے ہوئے اس کی نگاہیں مجھ پر تھیں،مگر ہاتھ اسی رفتار سے چل رہے تھے۔

''ہاں یاد ہے تو ان پر کیوں کرم نوازیاں کر رہی ہو؟''

''حسان ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اور وہ ابھی تو شفٹ ہوئی ہے۔ان کو کھانے کی پرابلم ہوتی ہو گی نا!''سادہ سے انداز میں کہہ کر اس نے کٹے ہوئے ٹماٹر ایک طرف رکھے اور ادرک اٹھا لی۔

''بس!مل گئی پوری کالونی کو مفت کی خادمہ، جو کام کر کے خود ہی شرمندہ بھی ہو گی اور وہ احسان کر کے تمہارے ہاتھ کا بنا کھانا لے کر مزے اڑائیں گی۔سبحان اللہ۔''میں نے ستائشی انداز میں سر جھٹکا۔

''تم بھی نئی شفٹ ہوئی ہو اور تمہاری بھی ابھی شادی ہوئی ہے،مگر بہت سادہ ہو تم......''میں گہری سانس بھر کر پیازوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''اوہو حسان!''اس نے ادرک کاؤنٹر پر رکھی اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی، میرے پاس آ گئی۔میں صوفے پر بیٹھا تھا، وہ میرے سامنے میز پر بیٹھ گئی۔

''اگر ہم کسی کا خیال کریں گے تو کل کو وہ بھی ہمارا خیال کریں گے اور آپ کو کہاں سے غلط فہمی ہو گئی کہ میں حال ہی میں شفٹ ہوئی ہوں؟''اس نے ہنس کر میری جانب دیکھا۔''میں تو ایک برس کی عمر سے اس گھر میں آ جا رہی ہوں۔میرے لیے تو کچھ بھی نیا نہیں۔''

میں نے سر اٹھا کر اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

''کیا یہ رشتہ بھی نہیں؟''

''ارے۔''وہ ہنس پڑی۔پھر میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی اور سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔''رشتہ تو نیا ہے،مگر ہم تو پرانے ہیں نا!''

''اور تو بہت ہی پرانا ہوں۔''بڑھتی عمر کے احساس کمتری نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، میری آواز میں خود بخود طنز در آیا تھا۔

''اب میں تو میں بھی پرانی ہوتی جا رہی ہوں۔''وہ مصنوعی اداسی سے بولی۔''ستائیس سال کی ہو گئی ہوں۔بڑی بمشکل سے شادی ہوئی، ورنہ اتنی اوور ایج لڑکی کو کون قبول کرتا؟''اس نے ایک لمحے کو گالوں پر سے یوں فرضی آنسو پونچھے کہ میں سمجھا وہ رو رہی ہے،مگر اگلے ہی پل وہ ہنس پڑی۔

کہنے کو تو میں بھی ہنس دیا،مگر دور کہیں میرے دل میں عجیب سا خیال آیا تھا۔

''پتا ہے حسان!''اس نے لاڈ سے سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔''میں جب کینیڈا میں تھی تو اکثر سوچا کرتی تھی، پتہ نہیں آپ کا انتخاب کون سی لڑکی ہو گی؟اور دل ہی دل میں مجھے اس لڑکی سے جیلسی ہوتی تھی اور جب اس روز، پارک میں آپ نے کہا،موموتم مجھ سے شادی کرو گی؟تو مجھے لگا، میں جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔مجھے نہیں پتا تھا کہ میں آپ کی زندگی میں اتنی اہمیت رکھتی ہوں۔''

وہ آنکھیں موندے بہت جذب کے عالم میں کہہ رہی تھی، یکدم چونک کر سیدھی ہو گئی۔

''اوہ،آئل گرم ہو گیا ہو گا۔''وہ کچن کی طرف بھاگی۔

میں نے ایک نظر مومو پر ڈالی،وہ اب چولہا آہستہ کر رہی تھی۔مجھے چند لمحے پہلے والی اس کی مصنوعی آنسوؤں والی حرکت یاد آ گئی۔

اس روز مجھے علم ہوا تھا کہ مومو بہت اچھی ایکٹریس ہے۔

***

''حسان!'' میں بیڈ روم میں بیڈ پر بیٹھا، تکیوں کے ساتھ ٹیک لگائے، ایک تھرلر پڑھ رہا تھا، جب مومو مجھے آوازیں دیتی اندر آ گئی۔

میں نے کتاب پر سے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر مسکرا دیا ''جی شہزادی مہر النساء!''

''اونہوں۔ ایک تو اتنا بیک ورڈ نام رکھا ہے، آپ نے میرا، اوپر سے اس میں شہزادی کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔'' وہ بیڈ کے قریب کھڑی ہو کر خفگی سے بولی۔

''اچھا اچھا، ڈاکٹر صاحبہ فرمائیے۔'' اس کی کولیگز اور اسپتال کا اسٹاف اسے مہر کہتا تھا۔

''ہاں، مجھے ذرا بتائیں، یہ آپ نے بنایا ہے؟'' اس نے ایک سفید کاغذ میری جانب بڑھایا۔

''کیا ہے؟'' میں نے کتاب ایک سائیڈ پر رکھی اور کاغذ ہاتھ میں لے کر کھولا، عینک کو درست کر کے ایک نظر ہی کاغذ پر ڈالی، تو میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

وہ بارہ سالہ مومو کا اسکیچ تھا، جو بارہ سالہ ماریہ نے بنایا تھا۔

''یہ آپ نے کب بنایا، حسان؟ اور مجھے کیوں نہیں دکھایا؟ کتنا پیارا ہے نا! مگر آپ نے کلرز کیوں نہیں کیے، اس میں؟ اور یہ صرف ہونٹوں پر ریڈ رنگ کیوں کیا ہے؟'' وہ اپنی دھن میں مگن بولے جا رہی تھی۔ جو وہ سمجھ رہی تھی، کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے؟ میں نے ایک اداسی بھری سانس لے کر سر بیڈ کراؤن سے ٹکا دیا، پھر کاغذ کو چہرے کے سامنے کر کے دوبارہ دیکھا۔

''ویسے آپ نے کب بنایا یہ؟'' وہ میرے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے کھلے بالوں کو سمیٹنے لگی۔

''یہ میں نے نہیں بنایا۔'' میں نے کاغذ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

بال سمیٹتے اس کے ہاتھ ایک لمحے کو رک گئے۔

''پھر......؟'' قدرے الجھن سے اس نے مجھے دیکھا۔

''یہ مومو نے بنایا تھا۔''

''مگر میں...... میں نے نہیں بنایا۔'' گود میں رکھے کیچر اٹھا کر بالوں کو اس میں جکڑتے ہوئے وہ اطمینان سے بولی۔

''تم نے نہیں...... میری ایک اور مومو بھی تھی۔'' میں نے بغور مومو کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ سوالیہ مگر سادہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''ایک لڑکی تھی ماریہ...... میری اکیڈمی میں آیا کرتی تھی۔ اس کا نک نیم بھی مومو تھا۔ میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔'' میں نے پھر کن اکھیوں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

وہ بہت دھیان سے میری بات سن رہی تھی۔ ماتھے سے بال پھر نکل کر چہرے پر آ گئے تھے، مگر وہ میری جانب پوری طرح متوجہ ہونے کے باعث محسوس نہیں کر پائی تھی۔

''مومو......! تمہیں برا نہیں لگا کہ میری ایک دوست بھی تھی؟'' اس کے شفاف اور کسی قسم کی رقابت سے بے نیاز چہرے کو دیکھ کر میں نے تنگ آ کر پوچھا۔

''برا کیوں لگے گا؟'' اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

''یہی کہ میں تم سے محبت کا دعوے دار ہوں اور دوسری جانب تمہاری غیر موجودگی میں، میں نے ایک لڑکی سے دوستی کی تھی۔''

''ارے نہیں حسان......! میں یہاں سے آپ کو کسی وعدے یا رشتے کا پابند کر کے تو نہیں گئی تھی، جس طرح میں آپ کی جانب سے آزاد تھی۔ اس طرح آپ بھی میری جانب سے آزاد تھے۔ خیر آپ اس لڑکی کا بتا رہے تھے، مومو کا کیا یہ وہی لڑکی تھی، جس کے لیے آپ نے سیٹ خالی رکھی تھی؟'' مومو نے فوراً بوجھ لیا تھا۔ وہ جتنی سادہ لگتی تھی؟ تھی نہیں۔

''ہاں، یہ وہی تھی اور اس سے پہلے کہ...... تم واقعتاً کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ، میں تمہیں بتا دوں کہ وہ ایک بارہ سال کی بچی تھی اور مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز تھی۔''

''میں غلط فہمی کا شکار کیوں ہو گی؟ آپ کی طرح شکی ذہنیت نہیں ہے میری۔'' وہ ہنس کر بولی تھی۔ ''بہت اعتبار ہے آپ پر......''

میں اسے ماریہ کے بارے میں بتانے لگا۔ کس طرح اس کی سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال کر ہسپتال میں داخل کروا دیا اور کس طرح وہ ایک خطرناک آپریشن کی وجہ سے فوت ہو گئی۔ جب میں نے مومو کو بتایا کہ آخری رات میں اس کے ساتھ تھا اور اس نے میرے سامنے مومو کا اسکیچ بنا کر یہ کہا تھا کہ ''آپ اپنی مومو کو منا لیں۔ تو مومو بے اختیار رونے لگی تھی، وہ ایسی ہی تھی، دوسروں کے دکھ درد پر رونے والی ہمدردی لڑکی۔

اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو دیکھ کر میں نے بے اختیار سوچا تھا، مومو نے یہ کیوں کہا کہ اسے مجھ پر اعتبار ہے؟

تو کیا مجھے اس پر اعتبار نہیں ہے؟

❋ ❋ ❋

مومو نے بچپن میں کبھی میرا اسکیچ نہیں بنایا تھا۔ یہ رویہ اس نے شادی کے بعد برقرار رکھا تھا۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ پہلے وہ مجھے اس خاص ''سلوک'' کی وجہ نہیں بتاتی تھی، البتہ اب اس نے جھینپتے ہوئے بتا دیا تھا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں غلط سلط نہ بنا دوں۔'' ہاں، مومو کے ڈر بہت لگا کرتا تھا۔

کبھی اس سے کسی سالن میں نمک مرچ تیز یا کم ہو جاتا، یا پھر چاول چپک جاتے تو وہ سارا کھانا اٹھا کر فریج میں چھپا دیتی اور میرے آنے سے قبل ہی ہوٹل سے کچھ منگوا لیتی، یا کوئی اور چیز پکا لیا کرتی تھی۔ اگر میں فریج سے خراب ہوا پکوان ڈھونڈ لوں تو ٹھیک، ورنہ خود سے وہ مجھے کبھی نہیں بتاتی تھی۔

ایک دفعہ سات سٹنگز میں مومو نے پڑوسن مسز طاہر کا پورٹریٹ بنایا، مگر آخری دن اس نے یہ کہا ''کینوس پر پینٹ گر گیا تھا، تصویر ضائع ہو گئی ہے۔'' چند دن بعد مجھے وہ پینٹنگ اس کی الماری سے مل گئی۔ اس میں وہ چہرے کی ساخت ٹھیک سے نہیں بنا سکی تھی۔ میں نے ہنس کر پینٹنگ واپس رکھ دی۔ اگر وہ عادت سے مجبور ہو کر اپنی غلطی کو چھپانا چاہتی ہے تو مجھے مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔

مومو بہت سی باتیں دوسروں کی ناراضی کے خوف سے انہیں نہیں بتایا کرتی تھی، وہ فطری طور پر بہت بزدل تھی۔

مگر مومو حساس بہت تھی، جہاں اسے میری ضروریات کا کہے بغیر علم ہو جاتا، وہاں وہ میرے احساسات تک بھی رسائی حاصل کر لیتی تھی۔ وہ جانتی تھی، میں اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہوں، اس لیے اگر کوئی فرد کسی پارٹی میں ہم دونوں کے عمروں کے تفاوت پر تبصرہ کر ہی لیتا تو وہ جو بہت نائس تھی، لگی لپٹی رکھے بغیر کھری کھری سنا دیتی تھی۔

مومو میرے ساتھ خوش تھی اور وہ خوش تھی تو میں بھی خوش تھا۔ عمروں کے فرق سے کیا ہوتا ہے؟ ہماری عمروں میں بائیس برس کا فرق تھا، مگر ہماری شادی کے بعد گزرنے والا ہر برس پہلے

سے زیادہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آتا تھا، ہم دونوں ایک مثالی جوڑی تھے۔ پرسکون، خوش اور مطمئن۔

تو یہ تھی میری کہانی۔ میری اور مہر النساء کی کہانی، جو بعض لوگوں کو کسی بھی عام لو اسٹوری کی طرح لگے گی تو بعض کو محبت کی ایک طویل داستان۔

وہ کیا فقرہ ہوتا ہے، فیری ٹیلز کے آخر میں؟ ہاں...... یاد آیا۔

''اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔''

تو میں اپنی داستان کا اختتام بھی اسی فقرے سے کرتا ہوں۔ میں، ڈاکٹر حسان رضا، جس نے ڈاکٹر مہر النساء حیدر سے بے حد محبت کی، طویل مسافت کے بعد شادی کر لی اور یوں ہم دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ یہ تھا ایک اچھی کہانی کا اچھا، خوشگوار انجام! مگر......

کاش کہ میں یہ لکھ سکتا، کاش میں اپنی کہانی کو یہیں ختم کر سکتا...... لیکن نہیں، ابھی میری اور مومو کی داستان اپنے اختتام کو نہیں پہنچی۔ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے، کیونکہ حقیقی زندگی میں ''ہنسی خوشی'' نام کی کوئی شے نہیں ہوتی......

یہ مومو کی کہانی ہے اور یہ مہر النساء کی کہانی ہے اور عورت کی محبت کی داستانوں کے اختتام پر ہنسی خوشی نہیں ہوا کرتا، یہی بتانے کے لیے تو میں یہ داستان آپ کو سنا رہا ہوں......

اگر آپ کسی رومانٹک قسم کی افسانوی سی ''ہیپی اینڈنگ'' کے متلاشی ہیں تو یہ داستان یہیں ختم کر ڈالیں۔ صفحے پلٹ کر کوئی رومانوی سی کہانی کھول لیں، جس میں نوجوان اور بے تحاشا خوبصورت لڑکا، لڑکی معمولی رکاوٹوں کے بعد شادی کر کے ہنسی خوشی رہنے لگ جاتے ہیں۔

لیکن اگر آپ عورت کی اصل محبت اور عورت کی محبت کے اصل کو جاننا چاہتے ہیں، اس کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو میرے ساتھ چند برس اور آگے چلنا ہوگا......

❋ ❋ ❋

میں نے جوں ہی سگریٹ کے پیکٹ کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا، مومو نے میرے سامنے میز پر ایش ٹرے رکھی۔

''کم پیا کریں، حسان!'' تھوڑی دیر بعد جب میں عادتاً سگریٹ کے کش لگا رہا تھا، کچن میں کام کرتی مومو نے خفگی سے کہا تھا۔ ''آپ کو پتا ہے، یہ آپ کو نقصان دے گی۔''

میں نے ایک نظر کچن میں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی مومو پر ڈالی۔ آدھے بازوؤں والی اسٹائلش سی قمیص، شلوار پہنے دوپٹہ ایک کندھے پر ڈالے، وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے، مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر اس کی بھوری پونی ٹیل سے، بال نکل کر لہرا رہے تھے۔ شادی کے بعد سے لے کر اب تک، اس نے بالوں کی لینتھ اور کٹنگ نہیں بدلی تھی۔

''روز نہیں پیتا۔'' میں نے سگریٹ کا آخری کش لگا کر اسے نہایت فرماں برداری سے ایش ٹرے میں پھینک دیا۔

''اب کیا فائدہ؟ اب تو ختم بھی ہو چکی تھی۔'' میری چیٹنگ کو بھانپ کر وہ برا سا منہ بنائے، رخ موڑ کر سبزی کاٹنے لگی۔

ہماری شادی کے ان آٹھ برسوں میں مومو نے کبھی نوکرانی نہیں رکھی تھی، وہ ہر کام خود کرتی تھی۔ ڈسٹنگ سے گارڈننگ تک، کپڑوں کی دھلائی سے ککنگ تک، مومو کو کبھی ہیلپر کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ یہ اس کا گھر تھا، وہ کہتی تھی۔ ''مجھے اس کے در و دیوار سے اس کے گملوں، اس کی مٹی تک سے پیار ہے۔'' اور وہ اتنے ہی پیار سے اس گھر کے تمام کام کرتی تھی۔ اس نے پریکٹس چھوڑ دی تھی، اس نے آرٹ اکیڈمی چھوڑ دی تھی، وہ بس اپنے گھر سے محبت کرتی تھی، اسے سجاتی، سنوارتی رہتی تھی۔

میں چینل بدلتے ہوئے کن اکھیوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا، مجھے بھوک لگ رہی تھی، صبح ناشتہ نہیں کیا تھا اور اب مومو دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

''کھانے میں دیر ہے، فی الحال یہی کھائیں۔'' اسی وقت اس نے آملیٹ اور توس میرے سامنے رکھے۔

''تمہیں کیسے پتا چلا مجھے بھوک لگی ہے؟'' باوجود کوشش اور اتنے برسوں کی پریکٹس کے، میں ہر بار اپنی حیرت چھپا نہیں پاتا تھا۔ جواباً وہ مسکرائی۔ مسکرانے سے اس کی آنکھوں کے گرد دھیمی دھیمی سی لکیریں پڑ جاتی تھیں، ان لکیروں کے علاوہ کوئی علامت نہیں تھی، جو اس کو چونتیس برس کا بتاتی تھی، وہ اب بھی بائیس تیئس سالہ لڑکیوں کی طرح دلکش اور اسمارٹ تھی۔

''بس مجھے پتا ہے۔'' وہ کہہ کر کچن میں واپس چلی گئی۔

میں نے پلیٹ اپنی جانب کھسکائی اور نیوز دیکھتے ہوئے آملیٹ کھانے لگا، یکدم مجھے پیاس

لگی۔

''یہ لیں...... پانی......'' مومو نے پانی کا لبالب بھرا ہوا گلاس، میرے سامنے میز پر رکھا۔

''مومو! تم......'' میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ وہ کچن میں واپس چلی گئی۔

میں نے آملیٹ کھاتے ہوئے چینل بدلا۔ ایک چینل پر ڈرامہ آ رہا تھا تو پتا نہیں کون سا تھا، مگر اس میں ایک اداکار (غالباً ہمایوں سعید) ایک روتے ہوئے، چھوٹے سے بچہ کو اٹھائے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سبزی کاٹتے کاٹتے مومو کے ہاتھ ایک دم رک گئے۔ بچے کی رونے کی آواز پر اس نے مڑ کر ٹی وی اسکرین کو دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم سفید سا پڑ گیا تھا۔ وہ چھری پلیٹ میں چھوڑ کر کچن سے نکل کر لونگ روم میں ٹی وی کے قریب آئی، اس کی نگاہیں اسکرین پر جمی تھیں۔ اس کے لب ہولے سے کپکپا رہے تھے۔

میں نے اس کے چہرے کو نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے چینل بدل ڈالا۔

اس کی محویت ٹوٹی تھی۔ اس نے چونک کر گردن پھیر کر مجھے دیکھا، پھر سر جھٹک کر تیزی سے کچن میں واپس چلی گئی۔

اس کا یہ ''ردعمل'' میں پچھلے کئی برس سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو میں نے کہا تھا نا، ہر کہانی کے اختتام پر ہیپی اینڈنگ نہیں ہوا کرتا تو ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

ہمارے ہاں اولاد نہیں تھی۔

اس بات کا مجھ پر نہیں، مومو پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

شادی کے بعد اکثر وہ ڈپریسڈ ہو جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھار ڈپریشن کے دورے بہت شدید ہوا کرتے تھے۔ وہ اکثر رات کو نیند میں بولتی بھی تھی، میں سننے کی کوشش کرتا، مگر اب میں بوڑھا ہو چکا تھا، میری حسیات کی کارکردگی 50 فیصد تک گھٹ چکی تھی۔ باوجود کوشش کے، میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔

پھر ایک روز میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''میں بانجھ ہوں، حسان!'' وہ ایک دم رونے لگی تھی۔

''میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ میں آپ کو اولاد نہیں دے سکوں گی۔''

"مجھے نہیں چاہیے اولاد موموا بس تم خوش رہا کرو۔" وہ آنسو پونچھ کر سر ہلا دیتی، مگر میں جانتا تھا، یہ غم اس کو اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے اس کے وجود کا کوئی حصہ بیچ راہ میں گم ہو گیا تھا۔

خیالات کی رو میں بھٹکے، میں نے ایک دم چونک کر مومو کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے، نچلا لب بے دردی سے کچلتی ہوئی، سبزی کاٹ رہی تھی، اس کی آنکھیں بہہ نکلنے کو بے تاب تھیں۔

میں نے تاسف سے اسے دیکھ کر سر جھکا لیا۔

***

"کب لائٹ آف کرو گی؟" ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی مومو کو نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے میں نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ جو چہرے کی کلینزنگ کر رہی تھی، میرے یوں دیکھنے پر جھینپ کر مسکرائی۔

"کر دیتی ہوں ڈاکٹر صاحب! ذرا کلینزنگ تو کر لوں۔" وہ نگاہوں کو نیچے جھکائے چھپنے چھپنے انداز میں بولی۔

میں نے مسکرا کر ساتھ رکھا، فیشن میگزین اٹھا لیا اور یونہی صفحے پلٹ کر نہایت غیر دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

"مومو...... یہ اس ایکٹرس کا کیا نام ہے؟" میں نے ایک اداکارہ کی تصویر دیکھتے ہوئے جیسے یاد کرتے ہوئے پوچھا۔ ایکٹرز کے نام یاد رکھنے میں، میں ہمیشہ سے کمزور رہا تھا۔

موئسچرائزر چہرے پر ملتے ہوئے وہ اٹھ کر میرے قریب آ گئی اور قدرے جھک کر صفحے پر دیکھا۔

"ڈیمی مور ہے، نیچے لکھا تو ہوا ہے۔" وہ میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھ کر اب ڈیمی مور صاحبہ پر لکھا گیا چٹپٹا کالم پڑھنے لگی تھی، اس کے ہاتھ ابھی تک چہرے پر موئسچرائزر مل رہے تھے۔

"اچھا...... میری عینک نہیں تھی، اس لیے پڑھ نہیں سکا۔ اب لائٹ آف کر دو نا!"

وہ میری بات سنے بغیر میگزین پر جھکی قدرے حیرت سے کچھ پڑھ رہی تھی۔

"حسان! یہ لڑکا کون ہے؟" اس کے چہرے پر متحرک ہاتھ اب رک چکے تھے۔ میں نے ڈیمی مور کے ساتھ تصویر میں کھڑے لڑکے پر بے توجہی سے نگاہ ڈالی اور کیپشن پڑھا۔

"کوئی ایشٹن صاحب ہیں۔"

"نہیں؟" اس نے میگزین میرے ہاتھ سے لے لیا۔

"یہ تو بچہ ہے بالکل۔"

"تو کیا ہو گیا؟" میں نے جمائی بمشکل روکی، مجھے نیند آ رہی تھی اور وہ محترمہ لائٹ آف کرنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

"کون ہے بھئی؟ ڈیمی مور کا بیٹا ہے کیا؟"

"ارے نہیں حسان بیٹا کہاں...... بوائے فرینڈ ہے، اس کا۔ مگر یہ تو بالکل ٹین ایجر لگتا ہے۔ اف توبہ...... یہ ڈیمی مور کو اس عمر میں کیا سوجھی!" اب وہ بڑے شوق سے آرٹیکل پڑھ رہی تھی، میں بور سا ہو گیا۔

"اس عمر میں کیا مطلب؟ وہ تو اب بھی جوان لگتی ہے۔"

"جوان کہاں ہے؟ مجھ سے بھی بڑی ہو گی اور یہ ایشٹن تو اس سے آدھی عمر کا ہے، لو کر لو گل۔ پہلے ڈیمی مور نے اتنے ایجڈ بروس ولس سے شادی کی تھی، تب یہ جوان تھی اور بروس ولس بڑی عمر کا۔ پھر اس سے طلاق لے لی اور اب بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں تو آدھی عمر کا بوائے فرینڈ! لاحول ولا قوۃ۔"

"بس ہوتی ہیں کچھ عورتیں۔ جنہیں......" "الیکٹرا کمپلیکس کا شکار" کہتے کہتے رک گیا۔

یکدم میں بالکل سن سا ہو گیا تھا۔

کئی سال پہلے میں نے مومو کو کہا تھا کہ وہ الیکٹرا کمپلیکس کا شکار ہے، مگر اب مجھے یقین سا ہو چکا تھا کہ وہ بالکل نارمل ہے اور اس نے مجھ سے شادی کسی نفسیاتی حس کی تسکین کے لیے نہیں، بلکہ میری محبت میں کی ہے۔

لیکن اس رات، اچانک مجھے وہ بات یاد آ گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں، میں ایک دم بے زار سا ہو گیا تھا۔

"لائٹ آف کر دو۔" میں بستر پر کروٹ دیوار کی طرف کر کے لیٹ گیا۔

"سو گئے؟" میگزین سائیڈ پر رکھ کر مومو نے مجھے پکارا تھا۔

میں نے جواب نہیں دیا، میری طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔

دن میں کتنی بار میں اپنی شکل دیکھتا تھا۔ کیا میں اس قابل تھا کہ مومو جیسی خوبصورت، پڑھی لکھی اور خود انحصار لڑکی مجھ سے شادی کرتی؟

میں ایک عام سی شکل کا مرد تھا، میرے اندر ظاہری طور پر سوائے ایک گریس فل پرسنالٹی کے کوئی خوبی نہ تھی۔

میرا احساس کمتری نہیں، بلکہ یہ کچھ اور تھا۔ جو مجھے یہ سب کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

ایک مبہم سا خیال، جسے میں ان گزرے برسوں میں بھلا چکا تھا، ایک دفعہ پھر میرے ذہن میں واپس آ چکا تھا۔

وہ خیال کیا تھا، کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے؟

* * *

"ڈاکٹر صاحب کل میرے ساتھ شاپنگ پر تو چلیں۔"

میرے ساتھ پارک میں واک کرتے ہوئے ایک دم مومو نے فرمائش کی۔ جب اسے مجھ سے کوئی کام ہوتا، وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کہتی تھی۔

"اچھا...... سوچیں گے۔" میں نے ٹال دیا، وہ قدرے مایوس ہو کر پتھریلی روش پر چلنے لگی۔

وہ آگے چل رہی تھی، میں پیچھے تھا۔ اطراف میں شام کے نیلگوں سائے اپنے پر پھیلا رہے تھے۔ اسٹریٹ لیمپس جل اٹھے تھے، آفس سے گھر واپس آنے والوں کی گاڑیاں اور موٹر سائیکلوں کا شور پارک کے پرسکون ماحول میں خلل ڈال رہا تھا۔ میں اور مومو روز اس ٹائم گھنٹہ بھر واک کرتے تھے۔ یہ وہ گھنٹہ ہوتا تھا، جب ہم دونوں بالکل خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے تھے، ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کرتے، بس اپنی اپنی سوچوں کے بھنور میں پھنسے رہتے۔ کبھی میں آگے نکل جاتا تو کبھی مومو...... وہ گھنٹہ بھر پرسکون ہوتا تھا۔ ہاں اگر مومو کو کوئی فرمائش کرنا ہوتی تو وہ اسی گھنٹے میں کرتی تھی، جیسے اس روز اس نے کی تھی۔

میں اس سے دو قدم پیچھے چلتے ہوئے اس کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے شولڈر کٹ بال ہمیشہ کی طرح کیچر میں ہاف بندھے تھے۔ وہ سر جھکائے کچھ سوچتے ہوئے چل رہی تھی، جب دفعتاً ٹھٹک کر رکی اور دائیں جانب دیکھا۔

میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں۔ ہمارے سے چند قدم کے

فاصلے پر دائیں جانب ایک چھوٹا سا، سات آٹھ برس کا بچہ اپنی ماں سے باتیں کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس نے سر پر پی کیپ پہن رکھی تھی اور چلتے ہوئے ماں کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ مومو ٹھٹک کر ان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں مخالف سمت سے آ رہے تھے، ہمارے قریب پہنچ کر ایک دفعہ پھر ہم سے دور جانے لگے تو مومو چہرہ موڑ کر ان کو دیکھنے لگی۔ میں ان سے چند قدم پیچھے تھا، اب مجھے اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس لمحے، اپنی نگاہیں اس سات آٹھ سال کے بچے کی پشت پر جمائے مومو کی بڑی، لانبی آنکھوں میں اتنی بے بسی، اتنی حسرت اور اتنا کرب تھا کہ میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔

"چلو مومو! گھر چلو......" میں اسے اس بچے سے دور لے جانا چاہتا تھا۔

مومو نے سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ اب بھی اس بچے کو اپنی ماں کے ساتھ دور جاتا دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"مومو!" میں نے اسے دوبارہ پکارا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر ایک دم مڑی اور بھاگتی ہوئی پارک سے باہر جانے والے رستے کی جانب جانے لگی۔

میری عمر اب بھاگنے والی نہیں تھی، سو میں تیز تیز چلتا ہوا، اس کے پیچھے گیا۔ مجھے پتا تھا، وہ گھر جا رہی ہے۔ اس کے پاس رونے کے لیے وہی جگہ تھی۔

"مومو......!" میں نے دروازہ بجایا۔

"مومو! دروازہ کھولو...... پلیز کھولو نا!"

مگر اس نے دروازہ نہ کھولا...... شدید ڈپریشن میں وہ خود کو کمرے میں بند کر لیا کرتی تھی، آج بھی اس نے یونہی کیا تھا۔

"مومو! دروازہ کھولو۔" میں نے ایک دفعہ پھر کہا، مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔

میں نے دروازے میں نصف لاک کی ہول سے اندر جھانکا۔ وہ دروازے کے بالکل سامنے والی دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کا سر اس کے گھٹنوں پر تھا، اس کا کیچر کہیں گر گیا تھا، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، وہ خود بھی ٹوٹی ہوئی بکھری بکھری، لگ رہی تھی اس کی دبی دبی سسکیوں کی آواز اور ہولے ہولے لرزتا وجود، بخوبی بتا رہا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔

شادی کے بعد یہ پہلی دفعہ تھا، جب وہ بے اولادی کے غم میں یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی

تھی۔ اس طرح ہچکیوں کے ساتھ تو وہ صرف ایک دفعہ اپنے گھر کے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ کر روئی تھی۔ کیا مجھے آپ کو یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ کیوں روئی تھی؟

"مومو.....!" میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا، مگر مومو نے دروازہ نہیں کھولا۔ اس کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔ اب مجھے سسکیوں کے بجائے اونچی آواز میں رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ رو رہی تھی، میری مومو رو رہی تھی۔ وہ جسے میں نے صرف ایک دفعہ ایسے روتے دیکھا تھا، وہ آج دوسری دفعہ ویسے ہی رو رہی تھی۔ پہلی دفعہ جب وہ ایسے روئی تھی، اس کے باپ نے چپ چاپ اس کی بات مان لی تھی، وہ کہتا تھا۔ "عمروں کے بے تحاشا فرق والی شادیاں غیر فطری ہوتی ہیں اور جو چیزیں غیر فطری ہوتی ہیں، وہ ایک دن ناکام ہو کر اپنی جگہ واپس آ ہی جاتی ہیں۔ ایسی شادیوں سے صرف دل ٹوٹتے ہیں۔" وہی حیدر میرے لیے مومو کی بات مان گیا تھا۔

آج اس کا باپ زندہ نہیں تھا، ورنہ اس کو چپ کرا دیتا۔ اس کو منا لیتا۔ میں تھا تو، مگر مجھے اس کو منانا ہی نہیں آتا تھا۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھنا بھی نہیں آتا تھا۔ میں تو کبھی مومو کے پیچھے اسے پکارنے بھی نہیں گیا تھا، پھر بھلا میں اب کیسے اسے مناتا؟

اس رات میں اسٹڈی روم میں سو گیا تھا، مومو پوری رات روتی رہی تھی۔

***

"جلدی آ جایئے گا، حسان!" میں اس صبح یونیورسٹی کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ مومو نے پیچھے سے آ کر کہا۔

میں نے کنگھی کرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے پیچھے کھڑی اپنی سمارٹ سی بیوی کا عکس دیکھا۔

"آ جاؤں گا جلدی۔ خیر تو ہے نا؟" میں نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے پرفیوم کی شیشی اٹھائی۔ اس نے شیشی میرے ہاتھ سے لے لی، میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"وہ اصل میں آج صارم آ رہا ہے نا، اس کی چھٹیاں ہیں۔ خالہ نے اسے پاکستان بھیج دیا ہے۔ میں نے کہا، خوامخواہ وہ لاہور میں دوسرے رشتے داروں کے پاس کیوں رہے۔ اس لیے خالہ کو کہہ دیا کہ چھٹیوں میں وہ ادھر ہی رہے گا۔ آخر میں اور دادو بھی خالہ کی طرف رہتے تھے۔ میں

نے ٹھیک کہا نا حسان؟" وہ اب پرفیوم مجھ پر اسپرے کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں بالکل ٹھیک کہا۔" میں ہولے سے اس کا گال چھو کر، اپنی کتابوں کی جانب بڑھ گیا۔

صارم کے بارے میں مجھے اتنا یاد تھا کہ وہ ہماری شادی پر موجود تھا۔ ایک چھوٹا سا، پیارا سا، دس بارہ سالہ بچہ، چلو اچھا تھا، وہ آ رہا تھا۔ اس کے آنے سے گھر میں رونق ہو جائے گی اور مومو جو اپنے کزنز کو اتنا مس کرتی تھی، وہ بھی خوش ہو جائے گی۔

یونیورسٹی میں کلاس کے دوران اور پھر بعد میں بھی صارم کا خیال میرے ذہن سے بالکل نکل چکا تھا۔ میرا دن خاصا مصروف گزرا تھا۔ یونیورسٹی کے بعد مجھے بینک میں کسی کام سے جانا پڑ گیا۔ وہاں سے نکلا تو ایک پرانا دوست راستے میں مل گیا، اسی چکر میں شام ہو گئی۔ مومو کی تاکید میرے ذہن سے بالکل نکل چکی تھی۔ سو آرام سے پانچ بجے کے قریب گھر پہنچا۔

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی، میں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے کوٹ اتار کر صوفے پر رکھا۔ اپنی کتابیں سینٹر ٹیبل پر رکھ کر، میں اپنے کمرے کی جانب بڑھنے ہی لگا تھا کہ یکا یک کچن کاؤنٹر کے ساتھ کھڑے اس اجنبی کو دیکھ کر چونک سا گیا۔

چھ فٹ سے نکلتا، چوڑے کندھے، اتھلیٹک جسم، وہ جو بھی تھا، اچھا خاصا باڈی بلڈر لگ رہا تھا۔ وہ میری جانب پشت کر کے کھڑا غالباً جوس پی رہا تھا۔ بلیک پینٹ پر سفید ٹی شرٹ میں ملبوس اجنبی نوجوان کو اپنے گھر میں دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹکا تھا۔

"ایکسکیوزمی.....؟" میری آواز پر وہ جوس پیتے پیتے کسی خیال سے چونکا اور پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس نے شاید میرے آنے کی آہٹ نہیں سنی تھی۔

پشت سے دیکھنے پر وہ مجھے پورا مرد لگا تھا، اس کی شکل پر ابھی لڑکپن تھا۔ لمبے قد، چوڑے کندھوں اور مسلز کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے تھوڑا بڑا لگتا تھا۔

"السلام علیکم سر.....! میں صارم ہوں۔" اس نے جوس کا گلاس کاؤنٹر پر رکھ کر قدرے لاپروا انداز میں تعارف کرایا۔ مجھے تو گویا جھٹکا لگا تھا۔ صارم تو میرے ذہن میں صرف دس گیارہ سال کا بچہ تھا، مگر یہ تو بھرپور مرد لگتا تھا۔ ہماری شادی کے وقت وہ نو یا دس سال کا تھا تو اب سترہ اٹھارہ برس کا ہو گا۔ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے، پتا ہی نہیں چلتا۔

"اوہ صارم.....! سوری میں پہچانا نہیں۔ مومو کے کزن ہو تم، رائٹ.....؟" میں نے

مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا، مگر میرے انداز میں گرم جوشی مفقود تھی۔ صارم نے بھی قدرے سرد انداز میں سلام کا جواب دیا۔

"ارے حسان، آپ آ گئے؟" اسی لمحے مومو بیڈروم کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اسی لمحے مجھے یاد آیا، اس نے مجھے جلدی آنے کو کہا تھا۔

"حسان! یہ صارم ہے۔ بڑا ہو گیا ہے، نا؟" وہ خوشی خوشی تعارف کرا رہی تھی۔ "اور صارم! یہ میرے ہزبینڈ حسان ہیں۔" اس نے ایک دفعہ بھی میرے دیر سے آنے پر شکوہ نہ کیا۔

"میں مل چکا ہوں۔" میں نے آواز میں گرم جوشی پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر مجھے وہ لاتعلق نظر آنے والا مغرور سالڑکا پتا نہیں کیوں، پسند نہیں آیا تھا۔

"مومو.......!" میں اندر کمرے میں ہوں، کھانا لگے تو بلا لینا۔" میں کوٹ اتار کر اندر چلا گیا۔

نہا کر میرا خیال تھا کہ میں فریش ہو جاؤں گا، مگر پتا نہیں کیوں، عجیب سی بے زاری میرے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ میں یونہی بستر پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا، جب میں ٹینشن میں ہوں، یا پریشان ہوں تو یونہی لیٹ جاتا تھا۔ مومو فوراً میرے پاس آ کر فکرمندی سے وجہ پوچھتی تھی اور میں اسے بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا تھا، مگر اس شام مومو پوچھنے نہیں آئی۔ وہ اپنے کزن کی خاطر مدارات میں مصروف تھی۔ اگر وہ پوچھتی تو میں کیا بتاتا، مجھے تو خود نہیں پتا تھا کہ مجھے پریشانی کس بات کی ہے۔

رات کھانے پر وہ مجھے بلانے آئی تو میں خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ کچن میں رکھی ٹیبل کے گرد رکھی چار کرسیوں میں سے میری مخصوص سیٹ پر صارم بیٹھا تھا، مجھے کچھ کوفت سی ہوئی۔ میں ایک دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ مومو کھانا لگانے میں اتنی مگن تھی کہ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ صارم میری کرسی پر بیٹھا ہے۔ یا شاید مومو میری جگہ کسی اور کو دینے پر رضامند ہو گئی تھی؟

میں نے ذہن میں آئے وسوسوں کو جھٹک کر اپنی توجہ میز پر رکھی ڈشز پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔

میکرونیز، رشین سلاد، فرائیڈ فش اور چکن ود پائن ایپل۔ اس نے غالباً صارم کے لیے بنائے تھے۔ میرے لیے اس نے الگ سے اچار گوشت بنایا تھا، مجھے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ

میری بیوی کو گھر آئے مہمان کا کتنا خیال تھا، مگر پتا نہیں کیوں مجھے خوشی نہیں ہوئی تھی۔

"یہ لو نا صارم!" اس نے میکرونیز کی ڈش صارم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ "اور ذرا فرائیڈ فش ٹیسٹ کرو، تم فش شوق سے کھاتے ہو نا۔"

اس کو صارم کی پسند ناپسند کا بخوبی علم تھا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی، مجھے اچھا لگتا تھا۔ وہ صارم کا بہت خیال رکھ رہی تھی، مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"حسان! یہ لیں نا!" س نے مجھے صرف ایک دفعہ فش کھانے کی آفر کی، مگر میں نفی میں سر ہلا کر اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ میں مچھلی نہیں کھاتا تھا، اس لیے اس نے دوبارہ نہیں کہا۔

چند لقمے کھا کر ہی میں اٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟ اچھا نہیں لگا کیا؟ مجھے اٹھتا دیکھ کر مومو نے حیرت اور فکرمندی سے مجھے دیکھا تھا۔ صارم اسی طرح لاتعلقی سے کھانا کھاتا رہا۔

"نہیں، اچھا ہے، بس میرا پیٹ بھر گیا ہے۔ اچھا میں سونے جا رہا ہوں۔" میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

مجھے افسوس تھا کہ آج ہم دونوں واک پر نہیں گئے تھے۔ کئی سالوں کی روٹین آج صارم کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ پتا نہیں اور کیا کیا ٹوٹنا باقی تھا۔

* * *

چھٹی کے دن میں دیر سے اٹھتا تھا، پھر بھی مومو کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ مجھے صبح سویرے اٹھا کر واک پر لے جائے۔ مومو صبح کی واک شام کی واک کی طرح روز نہیں کرتی تھی، بلکہ صرف چھٹی والے روز کرتی تھی۔ میں ورکنگ ڈیز میں واک پر جاتا تھا اور چھٹی والے دن عموماً سونا پسند کرتا تھا، مگر مومو ہمیشہ اٹھا دیتی تھی۔

اس چھٹی کے روز اس نے مجھے نہیں اٹھایا اور میں خود ہی آٹھ سوا آٹھ بجے جاگ گیا۔

منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلا تو صارم اور مومو کچن میں کھڑے تھے۔ مومو آٹا گوندھتے ہوئے بہت دھیان سے صارم کی گریجویشن کا کوئی قصہ سن رہی تھی۔ جب کہ وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا، اس کے ہاتھ میں چھری تھی، جس سے وہ آملیٹ کے لیے پیاز کاٹ رہا تھا۔

میں خاموشی سے آ کر لونگ روم کے وسط میں کھڑا ہو گیا، ان دونوں کی جانب پشت تھی۔

"اب آگے کیا کرو گے؟ لاء؟" موموا سے مخاطب کر کے پوچھتی ہوئی، بقیہ آٹا فریج میں واپس رکھنے کے لئے پلٹی ہی تھی کہ دفعتاً اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں حیرت درآئی تھی۔ "اتنی جلدی اٹھ گئے آپ؟"

پیاز کاٹتے صارم نے گردن پھیر کر مجھے دیکھا اور سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" میں چاہنے کے باوجود بھی لہجے کو شگفتہ نہیں کر سکا اور رخ موڑ کر موموکو مخاطب کیا۔

"واک پر نہیں چلنا؟"

"آج رہنے دیں حسان! آج تو صارم آیا ہوا ہے۔"

وہ سہولت سے کہہ کر صارم کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اس کی بڑی بھوری آنکھوں میں ایک عجیب سارنگ تھا، جو میرے لیے انوکھا تھا۔ یہ بہت پیار بھرا، مگر منفرد سارنگ تھا۔

"کل بھی واک مس کر دی تھی۔" میں نے دبا، دبا شکوہ کیا، مجھے کوئی پروا نہ تھی کہ صارم لب بھینچے تمام گفتگو سن رہا تھا۔

"اٹس او کے حسان! واک تو ہوتی رہے گی، مگر صارم تو صرف چند دنوں کے لیے آیا ہے۔"

اس کے انداز میں اطمینان تھا، میں اندر ہی اندر ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو چکا تھا۔

میں لونگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگا۔ کوئی نئی خبر نہ تھی، ایل ایف او، صدارتی انتخاب، صدر کے وردی اتارنے کا دباؤ، عراق جنگ۔

کچن سے موموا اور صارم کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں نے اخبار قدرے بے زاری سے میز پر پھینک دیا اور تیزی سے داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ مومو مجھے بھلا کیوں روکتی، اس کے خیال میں، میں واک پر جا رہا تھا۔

* * *

"میں تو چیلسی کے ساتھ ہوں اور آپ......؟"

صارم کی آواز پر میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ لونگ روم میں بچھے کارپٹ پر رکھے کشن پر بیٹھا، مومو سے مخاطب تھا۔ میں نے ٹی وی اسکرین کو دیکھا، چیلسی اور مانچسٹر یونائیٹڈ کا میچ آ رہا تھا۔ میں نے فوراً اخبار سائیڈ پر رکھ دیا۔

"مانچسٹر یونائیڈ کا میچ ہے؟" قدرے خوشی سے میں نے ریموٹ اٹھا کر آواز اونچی کی۔ مانچسٹر یونائیڈ میری فیورٹ ٹیم تھی۔

مومو ہاتھ میں چلغوزوں کی پلیٹ لے آئی تھی۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ چلغوزوں کی ڈش خود لے کر ایک ایک چلغوزہ نکال کر مجھے پکڑایا کرتی تھی۔ خود وہ کبھی نہیں کھاتی تھی، وہ صوفے پر میرے ساتھ بیٹھ ہی رہی تھی کہ صارم نے پوچھ لیا۔

"آپ کس کے ساتھ ہیں، مہر؟" وہ موموکو مہر کہتا تھا اور یہی بات تھی، جو مجھے بری لگتی تھی۔ ٹھیک ہے، دونوں کزنز تھے اور آپس میں از حد بے تکلفی تھی، مگر اس کو خود سے عمر میں بڑی موموکو "آپی" یا "باجی" کہنا چاہیے تھا، لیکن وہ لڑکا......

"کس کا میچ ہے؟" مومو نے ٹی وی اسکرین کو غور سے دیکھا، جب بھی کسی فٹ بال کلب کا میچ ہوتا، میں اور مومو ہمیشہ مانچسٹر یونائیٹڈ کے ساتھ ہوتے تھے۔ مجھے پتا تھا، اب بھی وہ میرے ساتھ ہی ہوگی۔

"چیلسی اور ایم یو کا۔ میں چیلسی کے ساتھ ہوں اور آپ؟" وہ گردن موڑے پوچھ رہا تھا۔

"چلو میں بھی چیلسی کے ساتھ ہوں، خوش؟" اس نے مسکراتے ہوئے چلغوزے کی گری نکالی۔ صارم نے آگے ہاتھ بڑھایا۔ مومو نے گری اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

اس لمحے مجھے اپنا وجود اتنا غیر ضروری، بے وقعت اور بے مول لگا تھا کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کتنی آسانی سے مومو نے کہہ دیا تھا کہ وہ چیلسی کے ساتھ ہے۔ وہ کتنی جلدی میرا ساتھ چھوڑ کر صارم کے ساتھ مل گئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی اور اس سے زیادہ دکھ ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے، مجھے نیند آ رہی ہے۔" اخبار میز پر رکھ کر میں کٹیلے لہجے میں کہتا ہوا، اندر کمرے میں آ گیا، میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

میں نے بستر پر لیٹ کر کمبل اوڑھ لیا اور بازو سے آنکھیں ڈھانپ لیں، مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

دروازہ کھلنے کی آہٹ پر مجھے اندازہ ہوا کہ مومو کمرے میں داخل ہوئی ہے۔

"حسان! کیا ہوا ہے؟" وہ میرے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔

اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

میں نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا، مگر اس کی آواز سن کر میرے اندر لگی آگ پر ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی تھی۔ میری مومو نہیں بدلی تھی، وہ ایسی ہی تھی۔

''حسان!'' اس نے زبردستی میری آنکھوں سے بازو ہٹا دیا۔ میں نے خاموشی سے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا ہے؟ آپ اٹھ کر کیوں آ گئے؟'' اس نے آہستہ سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر میری طبیعت چیک کرنے کی سعی کی۔

''مجھے نیند آئی ہے۔''

''آپ کو شاید برا لگا کہ میں نے صارم کی سائیڈ کیوں لی۔ ہے نا؟'' وہ میرے دل کی بات جان گئی تھی، میں نے جواب نہیں دیا۔

''وہ بہت Sensitive ہے حسان! اگر میں اسے تنہا چھوڑ دیتی تو وہ ہرٹ ہوتا۔'' وہ دھیرے سے میرے ماتھے پر آئے بال ہٹا کر بولی تھی۔

''کیا وہ واقعی نہیں بدلی تھی؟ اسے صارم کے ہرٹ ہونے کی پروا تھی، مگر میرے ہرٹ ہونے کی نہیں۔'' دل نے کہا تھا۔

''یہ بھی تو دیکھو کہ وہ تمہاری پروا کرتے ہوئے پریشان ہو کر اندر آئی ہے۔'' میرے اندر جیسے کسی نے مجھے سمجھایا۔ میں قدرے مطمئن سا ہو گیا۔

''اٹس او کے مومو! میں ٹھیک ہوں۔ مجھے واقعی نیند آ رہی ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا تو وہ کھڑی ہو گئی۔

''اچھا چلیں، پھر آپ سو جائیں۔''

''اور تم......؟'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''صارم کہہ رہا تھا کہ اسے پرانی کینیڈا والی البم دکھاؤں تو اب میچ ختم ہونے کے بعد وہی دکھاؤں گی۔ کچھ دیر لگ جائے گی مجھے۔ پھر باتیں بھی تو بہت کرنی ہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی اور میرے اندر دل و دماغ کی جنگ ایک دفعہ پھر چھڑ چکی تھی۔

پتا نہیں وہ کون سی باتیں تھیں، جو ان تین دنوں میں ان لوگوں نے نہیں کی تھیں۔

''آپ میرا انتظار مت کیجئے گا، سو جایئے گا۔''

اس نے کمبل ٹھیک سے میرے اوپر ڈالا۔ لائٹ آف کی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

''الیکٹرا کمپلیکس کا شکار عورت جب عمر کی تیسری دہائی میں پہنچتی ہے تو اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اس کو اپنے سے آدھی عمر کے لڑکوں میں......'' میں نے سر جھٹکا۔ کافی عرصے پہلے کتابوں میں پڑھی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

مگر مومو کو تو الیکٹرا کمپلیکس نہیں ہے۔ وہ ایک نارمل لڑکی ہے، اس نے مجھ سے محبت کی شادی کی ہے، کسی نفسیاتی گرہ کے باعث یہ بندھن نہیں باندھا۔

''محبت کی شادی؟'' کوئی جیسے میرے اندر ہنسا تھا۔

''کبھی خود کو آئینے میں دیکھو، کیا تم اس کے ساتھ سوٹ کرتے ہو؟''

وہ رات بھی بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزری۔

***

حالانکہ اس روز یونیورسٹی میں زیادہ کام نہیں تھا، پھر بھی میں نجانے کیوں بے حد تھک گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ دل و دماغ عجیب بوجھل پن کا شکار تھے۔ فضول وسوسوں سے جتنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا، وہ اتنا ہی مجھے گھیر لیتے تھے۔

گھر آیا تو مومو ہمارے بیڈروم میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی، کانوں میں بندے پہن رہی تھی۔ اس نے بال کھول رکھے تھے اور غالباً انہیں بلو (Blow) ڈرائی کر کے سیٹ بھی کیا تھا اور ہلکا ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا، کافی پنک شفون جارجٹ کے ڈریس میں وہ سجی سنوری سی بہت دلکش لگ رہی تھی۔

''بہت اچھی لگ رہی ہو، مومو!'' بہت عرصے بعد اسے یوں اپنے لیے سجا سنورا دیکھ کر، میری جیسے پورے دن کی تھکن دور ہو گئی تھی۔

اس نے گردن پھیر کر مجھے دیکھا، پھر اپنے مخصوص دلنشین انداز میں مسکرائی۔ ''میں تو ہمیشہ ہی بہت اچھی لگتی ہوں۔'' اس کا لہجہ شوخ تھا، میں ایک دم چونکا۔

مومو ایسی شوخ کبھی بھی نہیں رہی تھی، بہت کم عمری میں وہ بوڑھوں کی طرح سنجیدہ رہنے لگی تھی، لیکن پچھلے کچھ دنوں سے اس کی آواز میں ایک کھنک سی در آئی تھی۔ وہ مجھے پچھلے آٹھ برسوں

کے مقابلے میں زیادہ خوش اور زیادہ جوان لگی تھی۔

''بہت خوش لگ رہی ہو؟'' بظاہر میں مسکرا رہا تھا، مگر اندر سے میں ناخوش تھا۔

''ہوں۔'' اس نے مسکرا کر شانے اچکا دیئے، پھر دوپٹہ کندھے پر سیٹ کر کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر بولی۔ ''میں صحیح لگ رہی ہوں نا، حسان؟''

میں نے اس کے پیچھے اس کے آ کے اس کے دونوں کندھوں کو تھام لیا۔ ''بہت اچھی لگ رہی ہو مومو......!'' آئینے میں مجھے اس کا خوبصورت چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

''آپ چلیں گے؟'' بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں ایک دفعہ پھر سیٹ کرتے ہوئے وہ مصروف سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''اوہ میں بتانا بھول گئی۔ میں اور صارم دامن کوہ جا رہے ہیں، اس کو میں دراصل پاکستان گھمانا چاہ رہی تھی۔ آپ چلیں گے ساتھ؟''

اس کے شانوں پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ''تو تم اس لیے تیار ہو رہی تھیں؟''

''جی...... آپ آئیں گے؟'' اس نے گردن میں موجود نیکلس کو ٹھیک کیا۔

میں نے اپنے ہاتھ ایک دم اس کے شانوں سے ہٹا دیئے۔ ''نہیں، تم جاؤ۔'' میں اپنے کپڑے نکالنے الماری کی جانب بڑھ گیا۔ میرے اندر ہی اندر کوئی مجھے برچھیوں سے زخمی کر رہا تھا۔

''چلیں...... آپ کی مرضی۔'' اس نے پرس اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ ''کھانا کھا لیجیے گا، ہم تو شاید رات دیر سے آئیں۔'' وہ مجھے جاتے ہوئے ہدایات کر رہی تھیں، میں خاموشی سے الماری میں کپڑے ادھر ادھر کرتا رہا۔

''مہر...... چلیں نا!'' باہر سے صارم کی آواز آئی تھی۔

''ارے آ رہی ہوں نا، اچھا حسان، خدا حافظ!'' وہ عجلت میں کہتی وہاں سے چلی گئی۔

میں الماری کا پٹ کھلا چھوڑ کر کھڑکی کی جانب آیا اور پردہ سرکا دیا۔ وہ دونوں ہنستے بولتے، باتیں کرتے گاڑی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے، اتنے خوش کہ انہیں میری کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

میں خاموشی سے، بہت خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا۔

* * *

''صبح سو کر اٹھا تو لونگ روم سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں، میں ان دونوں آوازوں کو پہچانتا تھا۔

''اگر اس کا کزن چند دن کے لیے آ ہی گیا ہے تو مجھے یوں جیلسی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بے چارہ آخر میرا کیا لیتا ہے؟'' میں نے اپنے دل کو صارم کی طرف سے نرم کرنے کی کوشش کی۔

''مجھے ان کے ساتھ جا کر مہمان داری نبھانی چاہیے۔'' یہی سوچ کر میں اٹھا اور فریش ہو کر باہر چلا آیا۔

رات وہ دونوں دامن کوہ اور شکر پڑیاں سے خاصے دیر سے لوٹے تھے۔ مومو آئی تو میں سوتا بن گیا، اس نے بھی مجھے نہیں جگایا۔ حالانکہ اسے علم ہونا چاہیے تھا کہ میں رات دو تین بجے سے قبل نہیں سوتا تھا، سب سے پہلے بڑھاپا نیند ہی تو چراتا ہے......

میں فضول خیالات کو جھٹک کر لونگ روم میں آیا تو مومو اپنا کینوس اور ایزل سیٹ کر کے کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں برش تھا، جب کہ دوسرے میں پینٹ کی پلیٹ۔

صارم اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے پوچھا۔

مومو، جو بہت غور سے کینوس کو دیکھ رہی تھی میری بات پر چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

''صارم کا پورٹریٹ بنا رہی ہوں۔'' بات مکمل کر کے وہ برش سے کینوس پر اسٹروک لگانے لگی۔

میں جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔

مومو نے کبھی میرا پورٹریٹ نہیں بنایا تھا، کتنی منتیں کی تھیں میں نے اس کی، مگر وہ نہیں مانی تھی اور اب...... وہ صارم کا پورٹریٹ بنا رہی تھی۔ کیا اس کے لیے صارم مجھ سے زیادہ اہم تھا؟

میں کچن کی جانب بڑھ گیا، میں آئینہ نہیں دیکھ رہا تھا، مگر مجھے معلوم تھا کہ میرا چہرہ پل بھر میں تاریک پڑ گیا تھا۔

میری اندرونی توڑ پھوڑ ایک بار پھر سے شروع ہو چکی تھی۔

''مومو۔ ناشتا!'' میں نے اسے پکارا تو آواز میں خود بخود تلخی اور بے زاری سمٹ آئی تھی۔

''میز پر لگا دیا ہے حسان!...... ہلو نہیں، صارم!'' اس کی توجہ اپنے کینوس پر تھی۔
واقعی میز پر ہر شے سیٹ تھی، میں ناشتا کر کے اٹھا تو کمرے میں استری شدہ کپڑے اور پالشڈ جوتے پہلے سے رکھے تھے۔ میرا ہر کام وہ اب بھی اتنی ہی تندہی سے کرتی تھی، جیسے صارم کے آنے سے پہلے کرتی تھی۔ مگر اب اس کی توجہ بٹ چکی تھی اور مجھے اس کا صارم کو اہمیت دینا ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا، مجھے مومو مکمل چاہیے تھی، مگر وہ بہت مصروف تھی۔
میں اس سے کوئی بات کہے بنا ہی چلا گیا۔

***

''تمہیں یاد ہے صارم! جب میں کینیڈا میں ہوتی تھی تو اکثر سین خالہ کے پوچھے بغیر، تمہیں باہر لے جاتی اور......'' مومو اور صارم پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔
میں لونگ روم میں رکھے بڑے صوفے پر بیٹھا، بظاہر ٹی وی دیکھ رہا تھا، مگر متوجہ ان ہی کی طرف تھا۔
مومو میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھی تھی اور صارم ہمیشہ کی طرح اس کے قدموں کے قریب رکھے کشن پر بیٹھا، بہت توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی نظریں مومو کے چہرے پر تھیں اور مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں سے مجھے اور الجھن ہو رہی تھی۔
''میں بہت چھوٹا تھا۔ اس وقت اس لیے یاد نہیں، مگر مجھے وہ بسکٹ پھر بھی یاد ہیں، جو آپ نے بنائے تھے۔'' مومو نے بے اختیار قہقہہ لگایا تھا۔
''ممی اکثر ان بسکٹوں کا قصہ سناتی رہتی ہیں۔'' صارم مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا اور میں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔
''مہر......! آج پھر وہی بسکٹ بنائیں نا!'' اسی دم صارم نے بچوں کی طرح کہا، مومو نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
''چلو بنا لیتے ہیں، ویسے میں نے بڑا عرصہ ہوا بسکٹ نہیں بنائے، لیکن چلو، اب تمہارے لیے بنا لیتے ہیں۔'' وہ کچن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، صارم بھی اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔
''مگر آدھا کام تم کرو گے، سمجھے؟'' وہ اب مختلف اشیا، نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ہاں جی، میں آپ کا خادم جو ٹھہرا۔ مفت کا خادم۔'' وہ کچھ جل کر بولا۔ مومو بے اختیار ہنس دی۔
کچن میں کچھ پکاتے وقت مومو اکثر دوپٹہ اتار دیتی تھی، جیسے دوسری خواتین کرتی ہیں، ویسے بھی گھر میں صرف ہم دو ہی ہوتے تھے، کوئی مرد ملازم تو تھا نہیں۔
لیکن اس وقت مجھے کرنٹ لگا، جب صارم کے ساتھ بسکٹ بناتے ہوئے مومو نے لاپرواہی سے کندھے پر لہراتا دوپٹہ اتار کر سائیڈ پر رکھ دیا اور دونوں آستینیں کہنیوں تک فولڈ کر لیں۔
''آپ اس عمر میں بھی کتنی اسمارٹ ہیں مہر!'' صارم بے اختیار کہہ اٹھا تھا اور میں بے یقینی سے اپنی 'حیادار' بیوی کو دیکھ رہا تھا جو مسکراتے ہوئے تعریف وصول کر رہی تھی۔
جس مومو کو میں جانتا تھا، وہ باہر سر پر دوپٹہ تو نہیں لیتی تھی، مگر جسم کو اچھی طرح ڈھانپ لیتی تھی۔ کسی دوسرے مرد سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں سختی در آتی تھی۔
وہی مومو، صارم کے ساتھ ایسے کھڑی تھی؟ ٹھیک ہے کہ وہ اس کا کزن تھا اور چھوٹا تھا، مگر اس کو آپی یا باجی نہیں کہتا تھا۔ وہ نامحرم اور جوان تھا، کوئی بچہ نہیں تھا۔
میں مومو کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، میں اس سے کیا کہتا؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
بالآخر میں ریموٹ صوفے پر پھینک کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مومو اتنی مصروف تھی کہ اسے میرے پیچھے آنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

***

ان دنوں میں بہت چڑ چڑا اور بے زار رہنے لگا تھا، ہر وقت میرا دماغ فضول وسوسے سے بنتا رہتا۔ میں جتنی کوشش کرتا کہ ان سے پیچھا چھڑا لوں، وہ اتنے ہی میرے دماغ کو جکڑ لیتے اور کبھی کبھار مجھے وہ فضول نہیں "درست لگتے" تھے۔

مومو بدل رہی تھی، وہ میری مومو نہیں رہی تھی۔ وہ اب صارم کی مہر بنتی جا رہی تھی۔

صارم سبزی نہیں کھاتا تھا، وہ اب چکن بناتی تھی۔ صارم کو پرفیوم بہت اچھے لگتے ہیں، وہ جناح سپر سے کتنے ہی پرفیومز اس کے لیے لے آتی تھی۔ صارم کو بلیو اور گرے کلر اچھا لگتا ہے، مومو ان رنگوں کی بے تحاشا شرٹیں خرید کر اسے گفٹ کر چکی تھی۔ اس کی زبان پر نام ہوتا تو صرف صارم کا، اس کو خیال ہوتا تو صرف صارم کا۔

وہ بن بلایا مہمان اگر ٹھیک سے کچھ نہ کھاتا تو مومو پریشان ہو جاتی۔

"کھا کیوں نہیں رہے؟ میں کچھ اور بنا دوں۔"

اور وہ منع بھی کرتا، تب بھی وہ اس کے لیے مچھلی تلنے لگتی۔ مومو کو پراٹھے بنانا بہت برا لگتا تھا اور اب پچھلے تین ہفتے سے وہ روز صبح صارم کے لیے پراٹھے بناتی تھی۔ صارم کا نام لیتے ہوئے اس کی آواز میں بے حد نرمی اور آنکھوں میں ایک پیار بھرا تاثر ہوتا تھا۔ میں اس تاثر کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔ میرے دماغ میں بار بار خطرے کی گھنٹی بجتی تھی، مگر میں اس کو سننے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ شاید میں بے غیرت ہو گیا تھا۔

اپنی اسی کیفیت کے باعث اس روز ان آٹھ برسوں میں پہلی دفعہ میری مومو سے پہلی لڑائی ہوئی۔

میں نے اس سے رات کو کہا تھا کہ وہ میری سفید شرٹ استری کرے، مگر اس نے گرے والی

کر دی تھی۔

"یہ کیوں کی ہے؟ میں نے تمہیں بتایا تو تھا!" بات اتنی بڑی نہیں تھی، مگر میرے اندر ابلنے والے لاوے کو راستہ مل گیا تھا۔

"اوہ سوری حسان! وہ میں صارم کی گرے شرٹ لائی تھی نا تو وہ میرے ذہن میں وہی تھی۔" وہ ہنس کر اپنی بے وقوفی بتا رہی تھی۔

"میں صارم نہیں ہوں مومو!" ایک دم میں شرٹ پھینک کر غصے سے بولا تھا۔

اس نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "حسان!"

"میں صارم نہیں ہوں، میں تمہارا عام شکل وصورت والا بوڑھا شوہر ہوں، تم کیوں بھول جاتی ہوں؟" میری آواز میں زہر بھرا تھا۔

"حسان! میرے ذہن میں نہیں رہا، میں....." وہ یک دم خاموش ہو گئی۔ ڈانٹ سنتے وقت وہ ایسے ہی ہو جاتی تھی۔

"ہاں، تمہارے ذہن میں صارم کے علاوہ اور رہ کون سکتا ہے، تمہیں کہاں اپنا چھپن سالہ شوہر یاد ہو گا؟" میں نے استہزائیہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔ وہ الجھن بھری حیران نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

"سنو، یہ میرا گھر ہے، سرائے نہیں ہے۔ تم سبین سے کہو، وہ اپنے بیٹے کے لیے الگ گھر لے لے۔ بہت کماتا ہے، اس کا شوہر۔ مگر خدا کے لیے میری لائف ڈسٹرب نہ کرے۔"

"حسان!" وہ شاکڈ تھی۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ بے چارہ چار دن بعد چلا ہی جائے گا، میں خالہ کو کیسے کہہ سکتی ہوں؟"

"میں امید رکھوں گا کہ چار سے پانچ دن نہ ہوں، ورنہ سبین سے میں خود ہی کہہ دوں گا۔"

اپنی سفید شرٹ اٹھا کر میں واش روم میں گھس گیا۔ یہ امر ہی میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی تھا کہ صارم چار دن بعد میرے گھر سے دفع ہو جائے گا۔ مجھے ایک کمینی سی خوشی ہوئی تھی۔

✲ ✲ ✲

وہ صبح بہت عجیب تھی، میں ایک اچھی نیند لے کر اٹھا تو پتہ نہیں کیوں مجھے فضا میں کسی انہونی کی بو آئی۔ یوں لگتا تھا، جیسے ہوا مجھے کوئی پیغام دے رہی ہو۔

دل بھی عجیب سا ہو رہا تھا، طبیعت اور بھی بے زار تھی، میں نے ڈریسنگ روم سے اپنے کپڑے اٹھائے اور نہانے چلا گیا۔

یونیورسٹی کے لیے تیار ہو کر نکلا تو یونہی آئینے میں ایک نگاہ خود پر ڈالی۔

گندمی رنگت، عام نقوش، کنپٹیوں کے سفید بال، آنکھوں کے گرد بے تحاشا جھریاں......

میں مومو کے ساتھ ''سوٹ'' نہیں کرتا تھا۔

سر جھٹک کر میں اپنی کتابوں کی جانب بڑھ گیا، تب مجھے یاد آیا کہ رات میرے پین کی نب ٹوٹ گئی تھی۔

''ہوسکتا ہے مومو کے پاس کوئی پین پڑا ہو، جس سے میں آج کے دن کام چلا لوں۔'' مگر مومو، صارم کے لیے پراٹھے بنا رہی تھی۔ میں اس سے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے اس الماری کی جانب بڑھ گیا۔

اس کی الماری میں چار خانے کپڑوں کے تھے، درمیان میں ایک دراز تھی اور سب سے نچلا خانہ جوتوں کا تھا۔ مجھے نہیں علم تھا، وہ اپنی چیزیں کدھر رکھتی تھی۔ میں نے اس کی دراز کھول لی۔ وہاں بے تحاشا برش، پینٹس کے ڈبے، آئل پینٹس کی شیشیاں، رولز، پینسلز اور بہت سے کاغذ رکھے تھے۔ میں الٹ پلٹ کر کوئی قلم تلاش کرنے لگا۔

یک دم میرے ہاتھ کسی شیشی سے ٹکرائے۔ میں نے اسے آئل پینٹ کی شیشی سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہا، مگر دفعتاً میری نگاہ اسی شیشی پر لگے لیبل پر پڑی۔ وہ آئل پینٹ کی شیشی نہیں تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر اس کا نام پڑھا...... اور اس لمحے، ہاں یہ وہی لمحہ تھا، جب میری بہت خوشگوار زندگی برباد ہو گئی تھی۔

میں نے اس کا نام پڑھا، زمین اور آسمان میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے، مجھے چکر سا آیا، میں نے دیوار کو تھام لیا، اگر نہ تھامتا تو گر جاتا......

مگر گر تو میں گیا تھا۔ میں آسمان سے زمین پر پہنچا گیا تھا۔

وہ شیشی جو میرے ہاتھ میں تھی، وہ مجھے اپنی حیادار، وفا شعار بیوی کی الماری سے ملی تھی۔ وہ برتھ کنٹرول ٹیبلٹس کی تھی۔ بہت سے مناظر، بہت سی باتیں اور بہت سی سسکیاں مجھے یاد آئی تھیں۔

''میں بانجھ ہوں حسان! میں آپ کو اولاد نہیں دے سکتی۔'' وہ روتے ہوئے کہتی تھی۔

''میں ماں نہیں بن سکتی!'' وہ سسکتی تھی۔

کسی دوسرے کے بچے کو دیکھ کر روتی تھی، کمرہ بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔

میں نے آپ کو بتایا تھا نا، میری بیوی بہت اچھی اداکارہ تھی۔ وہ مجھے پچھلے آٹھ برسوں سے مسلسل بے وقوف بناتی آ رہی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی تھی، میں بانجھ ہوں اور میں آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتا تھا۔ اس نے مجھے کبھی اپنی رپورٹس نہیں دکھائی تھیں، اس نے کبھی کسی قسم کے علاج کی بات نہیں کی تھی۔

اگر آپ کو میری بات پر جھٹکا لگا ہے تو میں اصل بات آپ کو بتاتا ہوں۔ مومو دراصل کبھی میرے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ وہ نفسیاتی مریض تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی ہمدردی اور محبت میں آپ اس بات کو بھلا چکے ہوں، مگر میں نہیں بھولا تھا۔

مجھے یاد تھا، مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ الیکٹرا کمپلیکس کا شکار تھی اور وہ خود بھی یہ بات جانتی تھی۔ اسے پتا تھا، وہ ساری عمر میرے ساتھ نہیں رہ پائے گی۔ بڑھتی عمر اس کے احساسات کو الٹا دے گی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا، مومو ایک بہت سمجھدار لڑکی تھی۔، اسے علم تھا کہ تیس چالیس برس کی عمر میں کوئی نوجوان ایسا ہوگا، جس کے آگے وہ ہار جائے گی۔ اس سمجھدار لڑکی نے بہت سمجھ داری سے ساری پلاننگ کی تھی۔ وہ ماں بن سکتی تھی، مگر وہ ماں بننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اولاد کی زنجیر کو پاؤں میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کو معلوم تھا، ایک نہ ایک دن وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اپنی نفسیاتی حس کی تسکین کے لیے اس نے اپنی ممتا قربان کر ڈالی تھی۔ یہی وہ احساس جرم تھا، جو اسے سکون سے سونے نہیں دیتا تھا۔ بانجھ عورتیں کمرہ بند کر کے چیخ چیخ کر رویا نہیں کرتیں۔ وہ اکثر نیند میں بڑبڑاتی تھی۔

"I donot wanna do this. Some one help me please!"

اس کا احساس جرم اسے کچوکے لگاتا تھا، کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک مخلص لڑکی تھی، مگر اپنی نفسیاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ بہت آگے نکل چکی تھی۔

کتنی ہی دیر شیشی ہاتھ میں تھامے میں اسے دیکھتا رہا۔ میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

چونتیس برس میں نے اس عورت سے محبت کی۔ چونتیس برس میں سمجھتا رہا کہ میری ماں مجھے چھوڑ سکتی ہے، منگیتر نائمہ بے وفائی کر سکتی ہے، مگر مومو کبھی ایسا نہیں کرے گی۔

اگر مجھ میں غیرت اور عقل ہوتی تو پچھلے تین چار ہفتوں سے جو میرے گھر میں ہو رہا تھا، وہ مجھے جھنجھوڑنے کے لیے کافی تھا۔ مومو کا صارم کے لیے التفات میری نگاہوں سے چھپا نہ تھا۔ مگر پھر بھی میں خود کو کوس کر، اپنی شکی طبیعت کو مورد الزام ٹھہرا کر خاموش ہو جاتا تھا۔

مگر وہ شیشی...... اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔

بہت دیر میں دیوار کے سہارے ٹیک لگائے، ماؤف ہوتے ہوئے دماغ کے ساتھ کھڑا رہا، پھر جیسے کچھ ہوش آیا تو میں نے انگلیوں میں جکڑی مانع حمل گولیوں کی شیشی جیب میں ڈال لی۔

بہت تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے میں باہر آیا تھا۔ مومو اور صارم کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا، میں صرف زمین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مگن تھے، وہ جوان تھے، زندگی ان کے لیے ہنستی مسکراتی تھی اور میں بوڑھا، بے وقوف مرد دھیرے دھیرے چلتا ہوا باہر آ گیا۔

میں یونیورسٹی نہیں جا رہا تھا، مجھے خود نہیں علم تھا، میں کہاں جا رہا ہوں۔ تمام راستے انجانے لگ رہے تھے۔ جن راستوں کا میں راہی تھا، انہوں نے مجھے کہاں پہنچا ڈالا تھا۔

پتا نہیں، کب اور کیسے میں چلتا ہوا پارک آ پہنچا۔ یہ وہی پتھریلی روش تھی، جہاں میں چودہ برس کی اس لڑکی کے ساتھ جاگنگ کیا کرتا تھا۔ وہ لڑکی کدھر چلی گئی؟ میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟

میں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا سب کچھ تو لٹ چکا تھا۔ میری واحد متاع ”نیک بیوی“ تھی، جو اب کہیں بھی نہیں تھی...... میں، چھپن سالہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا، مگر مومو نے تو مجھ سے آنسو بھی چھین لیے تھے۔ میں نے اس کو کئی برس پہلے ”آئی ہیٹ یو“ کہا تھا، وہ اس دن بہت روئی تھی اور پھر اس نے بہت اچھا انتقام لیا تھا، مجھ سے۔

”رضوی صاحب کی بیوی کا پتا ہے، تم لوگوں کو؟“ میری سماعت سے ایک معمر آواز ٹکرائی۔

جس درخت کے ساتھ میں کھڑا تھا، اس کے پیچھے بنچ پر ہماری کالونی کے چند معمر، ریٹائرڈ بوڑھے روز کی طرح گپ شپ کے لیے جمع تھے۔ میں درخت کی اوٹ میں تھا، ان کی ویسے بھی

میری جانب پشت تھی، وہ...... میری موجودگی سے لاعلم، سی فائیو والے رضوی صاحب کو ڈسکس کر رہے تھے، میری ذہنی کیفیت مجھے ان کی کوئی بات نہ سننے دیتی، اگر میں عارف صاحب کا اگلا فقرہ نہ سنتا۔

”ہاں بھئی، رضوی صاحب نے گھر سے نکال دیا ہے۔ جن دنوں وہ فیکٹری کے کام سے فیصل آباد گئے تھے، ان کی بیوی ان کے دوست کے گھر آتی جاتی تھی۔ ان کے ڈرائیور نے رضوی صاحب کو آتے ہی بتا دیا۔ اب بتاؤ، کنوارے، اکیلے رہنے والے مرد کے گھر میں بھلا اس عورت کا کیا کام؟“

”ہاں بھئی، دنیا بڑی فریبی ہے۔ شکلیں جتنی معصوم ہوتی ہیں، کرتوت اتنے ہی گھناؤنے۔ اب یہ ڈاکٹر صاحب کی جوان بیوی کو ہی دیکھ لو تم!“ صبیح صاحب کہہ رہے تھے اور مجھے لگا، میں اگلا سانس نہیں لے سکوں گا۔

”کون ڈاکٹر صاحب؟“ عارف صاحب کو یاد نہیں تھا۔

”سی نائن والے ڈاکٹر صاحب، جنہوں نے اس عمر میں جوان لڑکی سے شادی کی تھی۔ بھئی۔ ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا، ایسی غیر حقیقی اور غیر فطری شادیاں نہیں چلا کرتیں۔ بوڑھا مرد، جوان عورت کو نہیں سنبھال سکتا۔“

مجھے لگ رہا تھا، کوئی مجھے چوک پر کھڑا کر کے کوڑے مار رہا ہو۔

”کیا ہوا حسان صاحب کی بیوی کو؟ وہ تو بڑی اچھی ہے۔ تمہاری بھابی جب بیمار ہوئی تھیں تو روز سوپ بنا کر بھیجا کرتی تھی۔“

”ارے یہ...... ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سوپ بنا کر، معصوم ادائیں دکھا کر اپنے جال میں پھنسانے والی۔ دیکھتے نہیں ہو، کیسے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، اس ولایت والے کزن کے ساتھ ادھر پھر رہی ہوتی ہے؟ ہم آنکھیں رکھتے ہیں میاں، کوئی بچے نہیں ہیں۔“

صبیح صاحب کے الفاظ مجھے چھلنی کر رہے تھے، میرا رواں رواں زخمی ہو چکا تھا۔

”صحیح کہتے ہو صبیح! محبت بے غیرت اور بے وقوف بنا دیتی ہے۔“

یہ انتہا تھی، میں اس سے آگے نہیں سن سکتا تھا۔ میں بے وقوف تھا، میں بوڑھا تھا، میں بے غیرت نہیں تھا۔

جس کو مفروضہ سمجھتا تھا، وہ چوک میں بیٹھے لوگوں کے لیے گوسپ بن چکا تھا۔

میرے اندر کا مرد جاگ اٹھا تھا۔ میں بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے درختوں کے جھنڈ سے نکلا اور ان دونوں کے پیچھے سے تیز تیز قدم اٹھاتا، پارک سے نکل گیا۔

میرا رخ گھر کی جانب تھا، مجھے مومو سے بات کرنا تھی، مجھے اس سے صرف دوٹوک بات کرنا تھی۔ میں مومو کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، میں اس بات کا بھی تصور نہیں کرسکتا تھا۔ میں اس کو معاف کرنے کے لیے تیار تھا۔ میں بوڑھا ہو چکا تھا، مجھے اس کی ضرورت تھی، اس قسم کے خیالات سے میں نے، اپنے اندر کے غیرت مند مرد کو اندر ہی دفن کرنے کی کوشش کی، آپ مجھے بے غیرت کہیں گے، آپ کہہ سکتے ہیں۔

بہت آہستگی سے میں نے گھر کا بیرونی دروازہ کھولا۔ دبے قدم اٹھاتا، میں اندر داخل ہوا۔

مومو اور صارم، میری آمد سے بے خبر تھے۔ ان کے خیال میں، میں یونیورسٹی جا چکا تھا۔

میں آگے بڑھنا چاہتا تھا، مگر لونگ روم کا منظر دیکھ کر مجھے اوٹ میں ہونا پڑا۔

صوفے پر بیٹھا صارم تھا، اس کے بہت قریب مومو بیٹھی تھی، اس کا سر صارم کے کندھے پر تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ صارم کا دایاں بازو مومو کے شانوں کے گرد تھا۔

کبھی ان آنسوؤں سے میں بھی ہار گیا تھا اور حیدر بھی۔

”میں تمہیں بہت مس کروں گی، صارم!“ وہ بھیگی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”مہر! آپ میری بات کیوں نہیں مان لیتیں؟ آپ میرے ساتھ کینیڈا آجائیں۔ میں وہاں جلد ہی الگ اپارٹمنٹ لے لوں گا، بس پھر میں ہوں گا اور آپ۔ ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔“

”کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے، میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واقعی تمہارے ساتھ چلی جاؤں...... مگر حسان......“ وہ متذبذب تھی۔

”آپ ان کو ایک دفعہ ہی بتا دیں، دوٹوک انداز میں بتا دیں۔“ وہ جیسے چڑ کر بولا تھا۔

”کیا بتا دوں؟“

”یہی کہ آپ ان جیسے خودغرض اور سیلف سینٹرڈ بندے کے ساتھ نہیں، بلکہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہیں۔“

”صارم! ایسے مت کہو، میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔“ میرے دل میں خوش گمانیوں

نے سر اٹھایا تھا۔

”ٹھیک ہے، پھر میرے بغیر رہ لیں گی آپ؟“ وہ جیسے خفا سا ہو گیا تھا۔

”نہیں رہ سکتی ناں! یہی تو مسئلہ ہے۔ تمہارے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ میں تو تمہیں دیکھ کر جیتی ہوں صارم! میں نے زندگی میں سب سے زیادہ محبت ہی تم سے کی ہے۔“

میری خوش فہمیوں کا گھڑا چکنا چور ہو گیا تھا۔

”حسان صاحب سے بھی زیادہ؟“

”آف کورس، صارم! کیا تمہیں شک ہے؟“ اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

زندگی میں پہلی دفعہ مجھے مومو سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ پہلی دفعہ میرا دل اس پر تھوکنے کو چاہا تھا۔

میں اوٹ سے نکلا۔ وہ دونوں میرے سامنے تھے، مگر انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔

”آئی لو یو ٹو مہر!“ صارم اس پر جھکا تھا، مومو نے آنکھیں موند لیں، اس نے مومو کے ماتھے پر اپنے لب رکھ دیے۔

”میں نے بھی اس دنیا میں سب سے زیادہ آپ سے محبت کی ہے۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ وہ اس پر جھکا، نہایت جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

”تو پھر لے جاؤ اپنی مہر کو۔“ ان دونوں کے بالکل سامنے آکر میں بلند آواز میں بولا تھا۔

کرنٹ کھا کر مومو اس سے علیحدہ ہوئی۔

”حسان آپ!“ وہ کھڑی ہوگئی، اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس نے بے اختیار کندھے پر آیا دوپٹہ، درست کیا، پھر قدرے گھبرا کر چہرے پر بکھرے بال سمیٹنے لگی۔ اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔

”تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتیں، پھر چلی کیوں نہیں جاتیں؟“ میں ایک قدم آگے بڑھا تھا۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر جیسے جبراً مسکرائی۔

”آپ کب آئے؟ یونیورسٹی نہیں گئے...... جج...... جلدی آگئے ہیں نا؟“

”نہیں مومو! مجھے تو بہت دیر ہوگئی ہے، اس مقام تک آتے آتے!“ میرا لہجہ سرد تھا۔

اس نے خوف زدہ ہو کر میرا چہرہ دیکھا۔ ''کک...... کیا ہوا حسان؟''

میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارا۔ وہ لڑکھڑا گئی۔

''چونتیس برس، مومو، چونتیس برس میں نے تم سے محبت کی اور تم...... تم گھٹیا عورت......''

میں نے ایک اور زوردار تھپڑ مارا تو وہ چکرا کر گر گئی، میں نے اسے اپنے پاؤں میں موجود جوتوں سے بھی ٹھوکر ماری۔

''ذلیل...... بدکردار...... حرافہ......'' میں اسے گالیاں بک رہا تھا۔ وہ صوفے پر گری، چپ چاپ پٹ رہی تھی۔

پھر ایک دم میں نے اپنا ہاتھ روک لیا، اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا، اس کا کچر ٹوٹ چکا تھا، مگر مجھے مومو پر ترس نہیں آیا تھا۔

صارم ششدر کھڑا سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

''حسان مجھے معاف کر دیں......؟'' صوفے پر بیٹھی، مومو میرے قدموں میں آ گئی۔ ''میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں...... مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، میں......''

وہ رو رہی تھی، میں نے اپنے بھاری بوٹ سے اس کے چہرے پر ٹھوکر ماری، وہ پیچھے کو گر گئی۔

''غلطی؟ تم اسے غلطی کہتی ہو؟ تم سمجھتی رہیں، یہ بوڑھا ہو گیا ہے تو شاید بے غیرت بھی ہو گیا، مگر میں بے غیرت نہیں ہوں۔''

''بس کریں حسان صاحب! چھوڑیں مہر کو۔'' میں اسے مارنے کو آگے بڑھا تو صارم نے بے اختیار مداخلت کی۔

''شٹ اپ صارم! تم جاؤ یہاں سے۔'' مومو نے ایک دم چیخ کر اسے روکا۔ اس کے بڑھتے قدم وہیں رک گئے۔

وہ اب صوفے کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اٹھایا۔ اور اس کا چہرہ اپنے بالکل سامنے کیا۔

''آٹھ سال تم مجھے دھوکا دیتی رہیں، کیوں؟ مجھے جواب دو!'' میں چیخ رہا تھا، اس نے ہونٹوں سے رستا خون ہتھیلی کی پشت سے صاف کیا اور کچھ کہنے کو لب کھولے......

''مم...... مم...... میں......'' وہ کہنے ہی لگی تھی کہ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دوائی کی وہ شیشی نکال کر اس کے سامنے کی۔

''یہ کیا ہے، مہرالنساء؟''

وہ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی، جیسے دو سو والٹ کا کرنٹ کھا کر لمحے کو دو قدم پیچھے ہٹی۔

اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، اس کا پورا وجود ایک لمحے کو لرز اٹھا۔

''یہ تم استعمال کرتی ہو نا مومو؟'' میں شیشی اس کے چہرے کے قریب لے جا کر پوچھ رہا تھا۔

وہ اسی طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے شیشی کو دیکھتی رہی۔

''مجھے جواب دو؟'' میں حلق کے بل دھاڑا تھا۔

کچھ کہنے کے لیے کھلے لب، اس نے بند کر کے زور سے آنکھیں میچ لیں، پھر انہیں کھول کر میری جانب دیکھا۔

اس لمحے میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ شاید وہ شیشی کسی اور کی ہو۔ مومو ڈاکٹر تھی، اس نے کسی کو دینی ہو گی۔ شاید میں بالکل غلط ہوں...... کاش ایسا ہو جائے، کاش مومو کہہ دے کہ یہ کسی اور کی ہے۔

''مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ، مومو! یہ تم استعمال کرتی ہو؟''

اس نے بہت بے بسی سے میری جانب دیکھا اور پھر مومو، میری مومو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے زور سے شیشی دیوار پر دے ماری۔ میرا سب کچھ جل کر ختم ہو چکا تھا۔

''چلی جاؤ تم یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ میرے گھر سے۔''

میں نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے آیا۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے خون رس رہا تھا، چہرہ متورم اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، وہ چپ تھی، بالکل چپ۔

''میں نے تم سے محبت کی، بے پناہ محبت، مگر تم بدکردار عورت، تم نفسیاتی مریض...... تم نے میرا مان توڑ دیا مومو! نکل جاؤ میرے گھر سے، دفع ہو جاؤ، میری نظروں کے سامنے سے......''

میں نے بیرونی دروازہ کھول کر اسے باہر دھکا دینا چاہا۔

''نہیں۔'' وہ ایک دم چیخی تھی۔ ''یہ میرا گھر ہے، میں نہیں جاؤں گی۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے، اس نے اپنی انگلیوں سے دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔

''یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔'' میں وحشیانہ انداز میں اسے باہر دھکیل رہا تھا، وہ میرے تھپڑوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی، دروازے کا کنارہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

''میں آپ کی بیوی ہوں، مجھے ایک دفعہ۔'' وہ روتے ہوئے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

''شٹ آپ۔'' میں نے اسے اپنے بوٹ کی ایک اور ٹھوکر ماری۔

''میرا اب تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''میں نے زور سے دروازہ بند کرنا چاہا۔ اس کی انگلیاں درمیان میں آکر کچلی گئیں، ان سے خون نکل کر وہیں چوکھٹ پر گرتا رہا۔

میں نے دروازے کھول کر اس کے خون آلود ہاتھ وہاں سے ہٹانے چاہے، وہ دروازے کو پکڑے بیٹھی تھی، جب کہ میں اسے دھکیل رہا تھا۔ اس کی پنک گھڑی اس کشمکش میں وہاں گر گئی۔

''اس گھر سے اب تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔'' اس کے ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں میرے اپنے ہاتھ خون آلود ہو چکے تھے۔

''نہیں آپ ایسے نہیں کر سکتے۔ چونتیس برس کا تعلق یوں ختم نہیں کر سکتے۔ حسان! آپ نہیں......'' وہ دروازہ پکڑ کر رونے لگی۔

''یہ خیال تمہیں اس وقت نہیں آیا، جب تم میرے گھر میں، میری ناک کے نیچے، اپنے کزن سے افیئر چلا رہی تھیں؟ جب میری غیر موجودگی میں تم مجھ سے بے وفائی کر رہی تھیں؟ تب تمہیں اس چونتیس برس کے تعلق کا خیال نہیں آیا؟'' میں بھڑک اٹھا تھا۔

یک دم مومو نے دروازے کی دہلیز چھوڑ دی، وہ صرف اور صرف مجھے دیکھ رہی تھی، اس کی نگاہیں جیسے پتھر کی ہو گئی تھیں۔ وہ بالکل ساکت ہو چکی تھی۔

''کیا کہا آپ نے؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

''تم کیا سمجھتی تھیں، مجھے پتا نہیں چلے گا؟ تم میرے گھر میں ایک غیر مرد کے ساتھ افیئر چلاتی رہو گی اور میں، میں بوڑھا اور بے غیرت بن کے تماشا دیکھتا رہوں گا؟ تم جھوٹی، بدکردار، ذلیل

عورت......'' بولتے بولتے میرا سانس پھول گیا تھا۔

اسی لمحے مومو زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی، اس کی انگلیوں سے خون رس رہا تھا، مگر اس کو درد نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی، میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''میں جھوٹی ہوں؟ میں بدکردار ہوں؟ ہاں میں جھوٹی اور بدکردار ہوں، میں آپ کے گھر میں اپنے کزن کے ساتھ افیئر چلاتی رہی ہوں...... ہاں میں بہت بری ہوں۔ ایک دفعہ آپ نے کہا تھا، تم نادان ہو۔ پاپا نے بھی یہی کہا تھا، آپ دونوں نے درست کہا تھا۔ ہاں میں نادان تھی، پاگل تھی، بے وقوف تھی، جو چونتیس برس آپ سے محبت کرتی رہی۔''

وہ مجھے دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹی، صارم تو پہلے ہی باہر جا چکا تھا۔

''میں......'' اس سے آگے بولنے کی ہمت مومو میں نہیں تھی۔ وہ کب لڑائی جھگڑوں میں بولا کرتی تھی۔

لب بھینچ کر وہ اپنے خون آلود ہاتھ لیے بھاگتی ہوئی صارم کے پاس چلی گئی، میں نے دروازہ بند کر دیا۔

میاں بیوی کے درمیان اصل رشتہ اعتبار اور اعتماد کا ہی تو ہوتا ہے، ہمارے درمیان وہ دونوں ختم ہو چکے تھے۔

میری مومو اپنی بدکرداری، اپنے جھوٹ کا اقرار کر کے میرے گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکی تھی۔

***

مومو ایک دفعہ پھر میری زندگی سے چلی گئی تو میں زندگی کو آٹھ برس پہلے کی اسٹیج پر لے آیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب مجھے مومو کا انتظار نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے آرٹ اکیڈمی بند کر دی اور اپنا خرچ صرف یونیورسٹی سے چلانے لگا۔

وہ گئی تو میرا گھر ایک دفعہ پھر ویران ہو گیا۔ میری ہر شے بے ترتیب ہو گئی، کوئی چیز بھی نہیں ملتی تھی۔ میں نے بالآخر ایک لڑکے کو ملازم رکھ لیا۔

اس ملازم لڑکے نبیل کو میں نے کہہ رکھا تھا کہ وہ مجھے ناشتے میں تلا ہوا انڈہ اور کافی نہیں دے گا، نہ ہی وہ لونگ روم میں ان ڈور پلانٹس رکھے گا۔ مومو کے تمام پودے میں نے اپنے گھر

سے باہر نکال دیے تھے۔

جس صبح وہ میرے گھر سے گئی تھی، اسی شام میں نے تمام سامان، کپڑے، جوتے، پاسپورٹ وغیرہ بیگ میں ڈال کر حیدر کے گھر پہنچا دیا تھا۔ یہ کام میں نے خود نہیں کیا تھا، بلکہ ایک ملازم کی مدد لی تھی۔

ہر روز صفائی کرتے وقت نبیل دروازے کی چوکھٹ پر لگے سیاہی مائل سرخ دھبوں کو صاف کرنے کی ناکام کوشش کرتا تھا۔ وہ دھبے صاف نہیں ہوتے تھے۔ مومو اپنی یادیں میرے گھر میں بکھیر کر چلی گئی تھی۔

تو یہ تھی میری کہانی۔ ایک بے وفا ماں سے شروع ہو کر بے وفا بیوی پر ختم ہونے والی داستان۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا، میں آپ کو کوئی افسانوی قسم کی Happy ending (خوشگوار اختتام) نہیں دے پاؤں گا، آپ کو چند کڑوے حقائق اپنے حلق سے نیچے اتارنے پڑیں گے۔

تو یہ میری کہانی کا اختتام تھا۔ اگر میں کوئی رائٹر ہوتا تو اپنی اور مومو کی کہانی یہیں ختم کر ڈالتا کیونکہ رائٹر کے پوائنٹ آف ویو سے آگے کچھ بچا نہ تھا۔

لیکن......

میری داستان ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ابھی کچھ باقی ہے، وہ ''کچھ'' جس کے لیے میں آپ کو یہ کہانی سنا رہا تھا۔

***

مومو کے جانے کے چار، ساڑھے چار برس بعد، یعنی کل شام میں کینیڈا آیا ہوں۔

مجھے یہاں ایک دنیائے آرٹ کے سیمینار میں شرکت کرنا تھی، ایک جگہ لیکچر دینا تھا اور بس میری کل صبح واپسی ہے۔

کل کی پوری شام سیمینار میں گزر گئی، آج کی صبح یونیورسٹی میں اور بالآخر میں ابھی گھنٹہ پہلے فارغ ہو کر ٹورنٹو کے مال پر آیا ہوں۔

مال کے ایک قدرے مہنگے سے اسٹور سے کچھ شاپنگ کرنے کے لیے میں وہاں گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں، ٹورنٹو کی سڑکوں پر پھرتے ہوئے مجھے لگتا تھا کہ میں سرِراہ مومو سے ٹکرا جاؤں گا۔ وہ رہتی بھی ڈاؤن ٹاؤن کے قریب ہی تھی، اگر اس نے الگ گھر لے لیا ہو تو الگ بات تھی، مگر سبین کا

گھر یہیں آس پاس ہی ہوتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ مومو، صارم کے ساتھ چلی آئی تھی۔

ایک گارمنٹس شاپ سے لیدر جیکٹ پسند کرتے ہوئے، میں مسلسل اطراف میں دیکھ رہا تھا، مگر وہاں مومو کہیں نہیں تھی۔ بالآخر میں اپنی جیکٹ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

جس لمحے میں کاؤنٹر پر کھڑا پے منٹ کر رہا تھا، مجھے اپنے دائیں جانب ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا۔

وہ مومو نہیں تھی، وہ صارم تھا۔

وہ بھی اپنے لیے جیکٹ پسند کر رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ بڑا اور ہینڈسم ہو گیا تھا۔ اس نے چھوٹی سی داڑھی بطور فیشن رکھی ہوئی تھی۔ اس کا قد اور بھی لمبا ہو گیا تھا۔

کتنے ہی لمحے میں صارم کو دیکھتا رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے اور وہ لڑکی مومو نہیں تھی۔

وہ شکل سے ایشین لگتی تھی، مگر شاید پلی بڑھی وہیں تھی۔ مجھے بہرحال صارم کو کسی اور لڑکی کے ساتھ دیکھ کر جھٹکا لگا تھا۔

جیکٹ کی پے منٹ کر کے صارم اپنا شاپر تھامے کسی بات پر ہنستے ہوئے اس لڑکی کے ہمراہ باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ دفعتاً اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔

اس کی ہنسی رک گئی، صرف ایک لمحہ لگا تھا، اسے مجھے پہچاننے میں، پھر اس نے منہ پھیر لیا۔

''صارم!'' اپنی انا، عزت نفس کو پس پشت ڈال کر میں نے اسے پکارا تھا۔

اس نے چہرہ میری جانب کیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تناؤ آ گیا تھا۔

''یس۔'' اس نے یوں مخاطب کیا، جیسے ہم اجنبی ہوں۔

میں ایک قدم آگے بڑھا۔ ''مجھے تم سے بات کرنا ہے۔''

میں نے چونکہ انگریزی میں کہا تھا، اسی لیے اس کے ساتھ موجود لڑکی ''او کے میں تمہارا ویٹ کر رہی ہوں'' کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

صارم نے تنفر سے مجھے دیکھا۔ ''جی۔ کیا بات کرنی ہے، آپ کو؟'' اس کا انداز کھڑا کھڑا سا تھا۔

''میں مومو کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں، وہ کیسی ہے؟'' ہم دونوں ایک ساتھ شاپ سے

باہر نکلے تھے۔ وہ میری جانب دیکھنے کے بجائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

''کیسا ہونا چاہیے؟'' اس نے الٹا مجھ سے پوچھا۔ ہم دونوں روڈ کے کنارے پر کھڑے تھے۔

''شادی کر لی اس نے؟ شاید نہیں کی، کیونکہ تمہارے ساتھ تو کوئی اور لڑکی ہے۔'' میں نے طنزیہ کہا۔

اس نے چہرہ میری جانب کیا۔

''وہ میری منگیتر ہے زیب۔''

''زبردست صارم، بہت اچھا۔ میرا گھر برباد کر کے تم نے منگنی رچا لی، کسی اور سے؟ تمہارے لیے مومو نے مجھے چھوڑا اور تم......!'' مجھے اس پر شدید غصہ آیا تھا۔

''سب سے پہلے تو حسان صاحب، آپ اپنی یہ غلط فہمی دور کر لیں کہ مہر نے آپ کو چھوڑا تھا۔ انہوں نے آپ کو چھوڑا نہیں تھا، آپ نے ان کو گھر سے دھکے دے کر نکالا تھا اور دوسری بات......'' وہ سرد اور کٹیلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''مجھے اپنے گھر کی بربادی کا ذمہ دار نہ ٹھہرائیں۔ آپ نے اپنا گھر خود برباد کیا تھا۔''

''میں نے؟'' میں نے بے یقینی سے اپنی جانب اشارہ کیا۔ ''میں نے اپنا گھر برباد کیا تھا، یا تم نے؟''

''آپ نے...... آپ نے اپنے ہاتھ سے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی۔'' وہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا۔

''اور تمہارا کوئی دوش نہیں؟''

اس نے ایک جھٹکے سے میری جانب دیکھا ''کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم نے میری بیوی کے ساتھ میرے گھر میں افیئر چلایا۔ صارم! تم نے میری اس بیوی کو مجھ سے چھین لیا، جس سے میں نے چونتیس برس محبت کی تھی۔ اور تم کہتے ہو کہ تم نے کیا کیا؟'' شدت ضبط سے میری آواز کپکپا رہی تھی۔

''حسان صاحب! آپ نے مہر سے ''صرف'' محبت کی تھی اور محبت ''صرف'' نہیں ہوا کرتی، محبت اعتبار اور اعتماد کے بنا ادھوری ہوتی ہے۔ آپ نے چونتیس برس مہر سے محبت کی، مگر

اعتبار نہیں کیا، بلکہ آپ نے تو شاید ان سے محبت بھی نہیں کی، آپ کو صرف ان کی ضرورت تھی۔ محبت تو صرف آپ نے اپنے آپ سے کی ہے۔ آپ ایک خودغرض سیلف سینٹرڈ اور خود پسند انسان ہیں۔ آپ کو ہمیشہ سے اپنا مفاد عزیز رہا ہے۔ اور مہر۔ حسان صاحب، آپ چونتیس برس اس عورت کو نہ سمجھ سکے؟ آپ جانتے ہیں مہر کون تھیں؟ آپ نہیں جانتے، آپ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

اس کی آنکھوں میں سرخی تھی، کرب تھا۔ اس کی آواز سے میرے لیے نفرت چھلک رہی تھی۔

''میں آپ کو بتاتا ہوں، حسان صاحب! مہر کون تھیں، وہ عوت جسے آپ نے بے عزت کر کے، دھکے دے کر مجھ سے افیئر چلانے کے الزام میں گھر سے نکالا تھا، وہ عورت، حسان صاحب......وہ عورت میری ماں تھی۔ میری سگی ماں!''

مجھ پر کسی نے آسمان توڑا تھا، میں جیسے کرنٹ کھا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔

''نن......نن......نہیں......'' میں نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ غلط کہہ رہا تھا، مومو کیسے......اس کی ماں......نہیں......

''یقین نہیں آیا نا آپ کو؟ کیسے یقین آ سکتا ہے، آپ کو؟ آپ تو اپنے شک میں بہت دور تک نکل چکے ہیں۔ آپ تو میرے اور ان کے تعلق کو، ہماری محبت کو اس گندی نظر سے دیکھتے رہے، جس کے بارے میں مجھے سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

مجھے لگا صارم رو رہا ہے......اس کی آواز بھیگ چکی تھی۔

''میری ماں نے زندگی میں صرف ایک غلطی کی تھی۔ میرے نزدیک یہ غلطی نہیں تھی، مگر ان کے نزدیک تھی۔ جس دن آپ نے ان کو رلایا تھا، ان کی عزت نفس کو کچلا تھا، اس دن انہوں نے روتے ہوئے اپنے پاپا سے کہا تھا کہ اگر حسان نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں اپنی مرضی سے کسی سے بھی شادی کر کے خود کو برباد کر ڈالوں گی، شاید تب ''سر'' کو دکھ ہو اور انہیں میرا خیال آئے۔ یہی پریشانی میرے نانا کی موت کا سبب بنی تھی اور اس کی وجہ بھی آپ تھے۔ صرف آپ! آپ نے ان کو دھتکارا تھا۔ نتیجتاً انہوں نے صرف آپ کو دکھ دینے کے لیے کینیڈا جاتے ہی سبین آنٹی کے دیور سے شادی کر لی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اپنے شوہر کے ساتھ وطن واپس آئیں اور آپ کو یہ سب کچھ بتا کر دکھ دیں۔ مگر ان کی شادی دو ماہ ہی چل سکی تھی۔ سبین آنٹی کے دیور، یعنی میرے فادر

کا دو ماہ بعد ہی ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔

جب سترہ سال کی عمر میں ماں بنیں تو انہیں لگا، انہوں نے غلطی کر ڈالی ہے۔ وہ مجھے سبین آنٹی کے حوالے کر کے پاکستان چلی گئیں۔ ان کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ امید باقی تھی کہ آپ ایک نہ ایک دن ان کی محبت کا یقین کر کے ان سے شادی کر لیں گے۔ یہی امید اور یہی خواہش تھی، جس نے ان سے جھوٹ بلوایا۔ یہاں کسی کو ان کی شادی کا علم نہیں تھا۔ سبین آنٹی نے سب سے چھپا لیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں، مہر کی شادی ہو جائے، اس لیے یہ بات مشرقی پوائنٹ آف ویو سے چھپانا ضروری تھی کہ وہ ایک بیوہ اور ایک بچے کی ماں بھی ہیں اور آپ سے چھپانا تو اور بھی ضروری تھا۔ وہ کہتی تھیں۔

"میں نے حسان سے اس لیے چھپایا کہ وہ شخص تو باسی کھانا نہیں کھاتا تھا، کسی دوسرے کے استعمال شدہ تولیے کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا، وہ بھلا کسی کی بیوہ کو کہاں قبول کرے گا؟"

میری نزدیک یہ ان کی غلطی تھی، لیکن غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔ وہ کوئی پرفیکٹ قسم کا افسانوی کردار نہیں تھیں، وہ ایک جیتی جاگتی انسان تھیں۔ ان سے بھی حماقت ہوئی تھی اور اس حماقت کا ثبوت میں تھا۔

سترہ برس میں کینیڈا میں سبین آنٹی کے پاس پلا بڑھا، سترہ برس میں ماں کی محبت کو ترسا۔ میری ماں اپنا گھر بسانے کے لیے مجھے چھوڑ گئی تھی، بالکل ایسے جیسے آپ کی ماں آپ کو چھوڑ گئی تھی۔ مگر میں نے حسان رضا کی طرح اپنی ماں کو بے وفا قرار نہیں دیا، میں ان کی مجبوری کو سمجھتا تھا۔ انہوں نے آپ سے ایک جھوٹ بولا اور اسے چھپانے کے لیے اور بھی کتنے جھوٹ بولے۔

وہ بہت سچے اور حساس دل کی مالک تھیں۔ انہوں نے اپنے بچے کو اس کا حق نہیں دیا تھا۔ وہ محبت نہیں دی تھی، جس کا وہ حق دار تھا۔ اس لیے ان کے دل میں احساس جرم تھا۔ وہ جب بھی کسی بچے کو دیکھتی تھیں۔ یہ احساس جرم انہیں بری طرح ڈسٹرب کر دیتا تھا۔ پھر وہ دوسرا بچہ کیسے کر سکتی تھیں۔ مہر کو قدرت نے محبت سے تخلیق کیا تھا، انہوں نے اپنے ہر رشتہ کو پوری محبت اور خیال سے نبھایا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھول جاتیں۔ وہ اپنی پہلی شادی کو بھی اپنی غلطی سمجھتی تھیں، احساس جرم اور آپ سے محبت کی اس کشمکش میں وہ دوسرا بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھیں اور شاید اپنے بچے کو ممتا سے محروم رکھنے کے جرم میں وہ خود کو سزا دے رہی تھیں۔ پھر انہیں یہ خدشہ بھی

ستاتا تھا، دوبارہ ماں بننے کے عمل میں کہیں یہ راز نہ کھل جائے کہ وہ پہلے بھی ماں بن چکی ہیں۔ اگر چہ سبین آنٹی انہیں سمجھاتی تھیں، لیکن میری ماں کے دل میں ڈر تھا، خوف تھا، اس محبت کے کھو جانے کا خوف، جو اس نے بہت کڑی ریاضت کے بعد پائی تھی، ہاں، میری ماں ڈرتی بہت تھی۔ صرف اسی ڈر خوف کے پیچھے، صرف اپنا گھر بچانے کی خاطر، انہوں نے اپنی ممتا قربان کر ڈالی۔ انہوں نے مجھے خود سے دور رکھا۔"

وہ وہیں گھاس پر بیٹھ گیا تھا، وہ رو رہا تھا، وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

"سترہ برس میں بن ماں باپ کے اپنے تایا، تائی کے پاس پلتا رہا۔ سترہ برس میں اپنی ماں کو یاد کر کے روتا رہا اور وہ بھی پرسکون نہیں تھیں۔ وہ ہر دوسرے بچے میں اپنا صارم ڈھونڈتی تھیں، وہ صارم جسے وہ روتا، بلکتا ٹورنٹو میں چھوڑ کر آئی تھیں...... صرف اور صرف آپ کی خاطر...... آپ کی وجہ سے میں سترہ برس اپنی ماں سے دور رہا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ آپ کی محبت انہیں صارم کو، اپنے بیٹے کو بھولنے پر مجبور کر دے گی، مگر ماں کی ممتا کے آگے ہار گئی تھیں۔"

صارم نے اپنا سر لیمپ پوسٹ کے ڈنڈے سے ٹکا دیا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"پھر انہوں نے مجھے بلوا لیا۔ سترہ برس بعد صرف اور صرف ایک ماہ کے لیے میں ان سے ملنے آیا۔ وہ تیس پینتیس دن ان کی زندگی کے لیے خوشگوار ترین دن تھے۔ ان کا جوان بیٹا، جوان کے کندھے سے بھی اونچا تھا، ان کے پاس آیا تھا۔ وہ کیوں نہ خوش ہوتیں؟

چونتیس برس انہوں نے آپ کی خدمت کی، حسان صاحب! اور پھر چونتیس برس بعد صرف چونتیس دن اپنے بیٹے کو پیار دینا چاہا، مگر آپ اتنے تنگ دل، خود غرض اور گھٹیا انسان تھے، آپ نے اس پر بھی شک کیا۔ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے بعد جس تیسری محبت کو اس دنیا کی سب سے عظیم اور خالص محبت کہا جاتا ہے، جس سے اللہ اپنی محبت کا موازنہ کرتا ہے، آپ نے اس محبت پر بھی شک کیا۔

صرف آپ کی وجہ سے میں ان کو کبھی "ماں" نہیں کہہ سکا۔ صرف آپ کی وجہ سے میں سترہ برس محرومیوں میں گھرا رہا۔ سترہ برس بعد مجھے میری ماں ملی تھی، مگر آپ نے کیا کیا؟ سب کچھ تباہ کر ڈالا۔"

وہ سر گھٹنوں پر رکھ کر ہچکیوں سے رو رہا تھا اور میں...... میں...... ساکت سا کھڑا، اس اونچے لمبے لڑکے کو روتے دیکھ رہا تھا، میرے جسم سے کوئی آہستہ آہستہ جان نکال رہا تھا۔

''مومو نے...... کیوں نہیں بتایا، یہ سب مجھے؟ صرف...... صرف ایک بار تو اعتبار کیا ہوتا مجھ پر! ایک بار تو کہا ہوتا کہ اس کا بیٹا بھی ہے، کیا تب میں اس کے بیٹے کو اپنا بیٹا سمجھ کر نہ پالتا؟'' میری آواز دور کہیں سے کسی کھائی سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

''ہاں!'' صارم نے تنفر سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔'' میں نے بھی یہی کہا تھا ان سے، جب آپ نے ان کو نکال دیا تھا۔

اور جانتے ہیں، انہوں نے آگے سے کیا کہا؟ انہوں نے کہا۔'' صارم! تم نہ بھی ہوتے تب بھی حسان مجھے مجرم ثابت کر ہی دیتے، میں انہیں اپنے پہلے شوہر کا بتا دیتی تو وہ اٹھتے بیٹھتے اس کے نام کے طعنے دیتے، میں سوچ میں گم ہوتی تو وہ مجھ پر اپنے سابقہ شوہر کو یاد کرنے کا شک کرتے۔ شک اس آدمی کی رگ رگ میں بھرا ہے۔'' اور آپ کہتے ہیں، وہ آپ پر اعتبار کرتیں؟ انہوں نے تو آپ پر بہت اعتبار کیا تھا، بس آپ نے ان پر نہیں کیا تھا۔

جس دن آپ نے ان کو گھر سے نکالا تھا، اس رات وہ میرے کندھے سے لگ کر بہت روئی تھیں اور میں...... میں ان کے ساتھ رویا تھا۔ وہ بار بار مجھ سے کہتی تھیں۔

''صارم! مجھے جگا دو، میں نے شاید کوئی خواب دیکھا ہے۔'' وہ اپنے چہرے پر ہاتھ لگا کر روتی تھیں۔

''صارم! حسان نے میرے منہ پر بوٹ مارا......''

وہ اپنے زخمی ہاتھ دیکھ کر روتی تھیں۔'' انہوں نے میرے ہاتھ دروازے میں کچل ڈالے...... وہ تو میرے آرٹسٹک ہاتھوں سے بہت محبت کرتے تھے، مجھے کانٹا بھی چبھ جاتا تو تکلیف انہیں ہوتی تھی۔ پھر انہوں نے یہ کیا کر دیا۔

اس رات میری ماں بہت روئی تھی اور اس رات مجھے پہلی بار آپ سے بے حد نفرت محسوس ہوئی تھی۔ میرا دل آپ کو قتل کرنے کو چاہا تھا۔''

صارم روتے ہوئے، بچوں کی طرح روتے ہوئے کہہ رہا تھا اور کوئی مجھے دو دھاری تلوار سے ذبح کر رہا تھا۔

یہ میں نے کیا کر ڈالا؟ میرے خدا...... یہ میں نے کیا کر ڈالا؟

میں نے اپنی مومو کو اپنے گھر سے نکال دیا؟

اس مومو کو جس کے لیے میں کتابیں لاتا تھا، جس کے ساتھ میں کافی پیتا تھا، جس کے رنگوں اور تتلیوں سے میں محبت کرتا تھا...... میرے اللہ...... میں نے اس مڑی ہوئی پلکوں والی لڑکی کے ساتھ کیا کر ڈالا؟

سترہ برس بعد اسے اس کا بیٹا ملا تھا اور میں نے اس کو کیا سزا دے ڈالی؟ میں نے اس کے چہرے پر اپنا بھاری جوتا مارا، وہ جوتا اس کی پلکوں سے بھی تو لگا ہوگا، اس کی ان پلکوں سے جن سے مجھے محبت تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ لہولہان کر ڈالے، وہ ہاتھ جن کو میں دنیا کے خوبصورت ترین ہاتھ کہا کرتا تھا۔ میں نے اس کو ایک دفعہ پھر رلایا، یہ کیا کر دیا میں نے؟

اپنی خود ساختہ تھیوریوں میں، اپنی فضول سوچوں سے میں نے اپنے آنگن کو جلا ڈالا؟ یہ کیا کر دیا میں نے؟

''آپ نے مجھ سے میری ماں چھین لی، حسان صاحب! اب آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

وہ سرخ، گیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ میں اسے کیا جواب دیتا، میرے پاس کہنے کو کچھ بھی تو نہیں تھا۔

''صارم......! مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو۔ میں...... میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ وہ...... وہ...... مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتی۔ وہ کبھی مجھ پر ناراض نہیں ہوئی۔''

میں گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا تھا، میرے ہاتھ صارم کے آگے جڑے تھے۔

''سوری حسان صاحب......! اب آپ کو دیر ہو چکی ہے۔ اب آپ کو روز حشر اپنے کیے کا جواب دینا ہوگا۔ میری ماں دو سال پہلے تھائی راڈ گلینڈ کے کینسر سے مر گئی۔ آپریشن کے دوران ان کے تھائی راڈ کے پیچھے والی رگ کٹ گئی تھی، نہ بھی کٹتی تو بھی اندر سے تو، آپ نے انہیں مار ہی ڈالا تھا۔''

اس نے بے حد نفرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی۔

''آپ جو خود کو بہت ذہین سمجھتے تھے، ایک ماں کی محبت کو نہ پہچان سکے، مگر آپ بھی کیسے پہچانتے، آپ نے ماں کی محبت دیکھی کب تھی؟''

میں گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھا ہوں اور صارم...... صارم جا چکا ہے۔

میں یہی بتانا چاہتا تھا، آپ کو۔ مجھے میرا علم مجھے دھوکا دے گیا تھا۔ کتابوں میں لکھی ساری باتیں سچ نہیں ہوتیں۔ صرف علم کا سہارا بہت کمزور ہوتا ہے۔ کتابوں میں جو تھیوریاں ہوتی ہیں، انہیں جیتے جاگتے انسانوں پر اپلائی کرنا، کتنا غلط ہوتا ہے۔ ہم ایک جہاں کا علم حاصل کر لیتے ہیں، دنیا بھر کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں، لیکن ایک انسان کو نہیں جان پاتے، اسے نہیں سمجھ پاتے۔

میں یہی بتانا چاہتا تھا، آپ کو کہ اس دنیا میں فلمی اور افسانوی رومانس بھری جذباتی کشش جسے آپ اور میرے جیسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایک محبت ہوتی ہے، وہ محبت جس کا مقام اس دنیا کے تمام رشتوں میں پائی جانے والی محبت سے ارفع ہے۔ وہ محبت ماں کی محبت ہوتی ہے اور میں وہ بدقسمت انسان ہوں، جو کسی بھی محبت کو نہیں پہچان سکا۔ پہچانتا بھی کیسے ماں کی محبت تو دیکھی ہی نہیں تھی، تھیوریوں پر یقین کر کے میں موموکی محبت پر بھی یقین نہیں کرتا تھا۔

اور اب...... صارم میرے پاس سے جا چکا ہے، جاتے ہوئے وہ کہہ کر گیا ہے کہ جس مومو کے بارے میں آپ کو فخر تھا کہ وہ آپ کے پکارنے سے پہلے ہی آ جاتی تھی، آج آپ اس کو جتنا پکاریں گے، وہ نہیں آئے گی۔

میری مومو، بھی اس بیماری سے مر گئی، جس سے کئی برس پہلے ایک اور مومو مر گئی تھی۔

میں، جس نے کبھی موموکو نہیں منایا، آج ٹورنٹو کی اس مصروف سڑک کے کنارے، گھاس پر گھٹنوں کے بل بیٹھا یہ سوچ رہا ہوں کہ میں اس لڑکی کو کیسے مناؤں، جس سے میں نے چونتیس برس محبت کی؟

میں اپنی مومو، حیدر کی مہر النساء اور صارم کی مہر کو کیسے پکاروں؟

اسے کہاں ڈھونڈوں؟

* * *